رسیدی ٹکٹ

امرتا پریتم

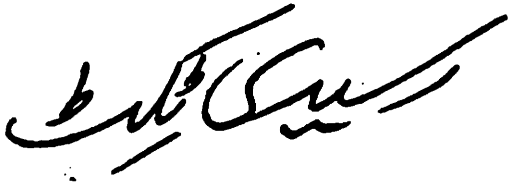

رسیدی ٹکٹ

امرتا پریتم

علی ہجویری پبلشرز
ایچ ۱۱۸-اے اندرون اکبری گیٹ، لال حویلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ـــــ تنویر احمد

مطبع ـــــ تاج پریس لاہور

قیمت ـــــ ۱۵ روپے

ਪਿਤਾ ਦਰਸ਼ਨ ਜੀ

ਦੇ ਪਿਆਰ ਦੀ ਤੜ੍ਹ,

ਜੋ ਉਸ ਪਾਸ ਸੀਤਾ ਹੈ

ਕਿਸੇ ਤੁਰ ਨਤੀਜਾਂ ਤਕ

ਦੇ ਮਿਹਨਤ ਦੇ ਰਾਹ

ਜੋ ਰਾਮ ਦਾਸਤਾਨ ਸਾਹਿਬਾਂ

— ਲੇਖਕ

امروز اور اپنے دونوں بچّوں کے لالا اور نوزانہ کے نام

امرتا پریتم

یہ دوسرا ایڈیشن

رسیدی ٹکٹ کا جس وقت ہندی اور انگریزی میں ترجمہ ہو رہا تھا، میرے کئی ماہ اس کی پکڑ میں رہے، اس لیے کئی حصے نئے لکھے گئے۔ جو ان زبانوں کے تراجم میں تو شامل ہو گئے۔ لیکن پنجابی میں، اس کتاب کے چھپ چکنے کے باعث رہ گئے۔ وہ نئے اوراق اب اس نئے ایڈیشن میں شامل کر رہی ہوں۔

سوچتی تھی، نظموں کو بھی ان کے وقتِ تصنیف اور محرک کے تذکرہ کے ساتھ شامل کر سکوں لیکن پھر رسیدی ٹکٹ کو چھاپ سکنا میرے بس سے باہر ہو جاتا۔ اس لیے اس خیال کو میں نے دو مزید حصص میں تقسیم کر دیا۔ "میں جمع میں" اور "میں جمع دنیا" ہیں، جن میں سے ایک جلد میں صرف وہ نظمیں ہیں (محرک واقعہ اور وقت سمیت) جو ایک ہستی کے متعلق ہیں، یعنی میرے "تم" سے اور دوسری جلد میں صرف وہ جو دنیا میں پیش آ رہے ہیں۔ واقعات سے منسلک ہیں۔

میں کے بغیر نہ تم کے معنی نکلتے ہیں، نہ دنیا کے۔ یہ میں کے آگے تم کا سفر ہونا ہے اور تم کے آگے اپنی کائنات کا۔

دونوں حالتوں میں یہ میں کی وسعت کا سفر ہوتا ہے۔ وہ کتاب "میں جمع میں" "سمیت میں جمع دنیا کے" علیحدہ سے چھپی ہے۔ اور یہ رسیدی ٹکٹ الگ ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسری کی تکمیل ہیں۔

——— امرتا پریتم

رسیدی ٹکٹ

ایک دن خوشونت سنگھ نے دورانِ گفتگو کہا "تمہاری سوانح کا کیا ہے، بس ایک حادثہ! لکھنے بیٹھو تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے"۔ رسیدی ٹکٹ شاید اس لیے کہا کہ باقی ٹکٹوں کا سائز بدلتا رہتا ہے لیکن رسیدی ٹکٹ کا وہی چھوٹا سا رہتا ہے۔ ٹھیک ہی کہا تھا ——— جو کچھ بیتا تھا، دل کی تہوں میں بیتا تھا اور وہ سب کچھ نظموں اور ناولوں کے حوالے ہو گیا۔ پھر باقی کیا رہا؟ پھر بھی کچھ سطور لکھ رہی ہوں ——— کچھ یوں جیسے زندگی کے حساب کتاب کے کاغذ پر ایک چھوٹی سی رسیدی ٹکٹ چسپاں کر رہی ہوں، نظموں اور ناولوں کے حساب کتاب کی کچی رسید کو پکی رسید کرنے کے لیے!

قیامت کا دن

کیا یہ قیامت کا دن ہے؟ زندگی کے کئی وہ لمحے جو وقت کی کوکھ سے پیدا ہوئے، زندہ رہے اور وقت کی قبر میں جا پڑے، آج میرے سامنے کھڑے ہیں ...... یہ تمام قبریں کیسے وا ہو گئیں؟ اور تمام لمحے جیتے جاگتے قبروں میں سے کیسے نکل آئے؟ یہ ضرور قیامت کا دن ہے ....

۱۹۱۸ء

یہ ۱۹۱۸ء کی لحد سے نکلا ایک لمحہ ہے۔ میرے وجود سے بھی ایک سال پہلے کا، آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں، پیشتر صرف سنا تھا۔ میرے ماں باپ، دونو پنج کھنڈ بھسوڑ کے سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہاں کے سربراہ بابو تیجا سنگھ کی بیٹیاں ان کے طالب علموں میں سے تھیں۔ ان بچیوں کو ایک دن جانے کیا سوجھی، دونو نے مل کر گوردوارہ میں کیرتن کیا، ارداس کی اور ارداس کے آخر میں کہہ دیا، "دو جہانوں کے والی! ہمارے ماسٹر جی کے گھر ایک بچی بخش دو!" بھری سنگت (اجتماع) میں والد نے دعا کے یہ الفاظ سنے تو انہیں میری ہونے والی ماں پر طیش آیا۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ ان بچیوں نے ان کی رضامندی سے یہ دعا کی تھی، لیکن ماں کو کچھ پتہ نہ تھا۔

ان بچیوں نے ہی بعد ازاں بنایا کہ اگر راج بی بی سے پوچھتیں تو وہ شاید بیٹے کی تمنا کرتی، لیکن وہ اپنے ماسٹر جی کے گھر لڑکی مانگتی تھیں، اپنی طرح کی لڑکی۔ یہ لمحہ ابھی تک خاموش ہے —— قدرت کے اسرار کو ہونٹوں میں بھینچ کر ہولے سے مسکراتا، پر کہتا کچھ نہیں ان بچیوں نے یہ ارداس کیوں کی؟ ان کے کون سے اعتقاد نے سن لی؟ مجھے کچھ خبر نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ سال کے اندر اندر راج بی بی، راج ماں بن گئی۔

اور اس سے بھی دس برس پہلے —— وقت کی قبر میں سویا ہوا ایک وہ لمحہ جاگ اٹھا ہے جس لمحے بیس سال کی راج بی بی نے گوجرانوالہ میں سادھوؤں کے ایک ڈیرہ میں متھا ٹیکا اور اس کی نظر کچھ اتنے ہی سال کے نند سادھو پر جا پڑی۔ نند سادھو ساہوکاروں کا بیٹا تھا۔ جب چھ برس کا تھا، ماں لچھمی مر گئی تھی۔ اس کی نانی نے اس کو گود لے لیا تھا اور دانہ چھڑنے والی ایک عورت کے دودھ پر پال لیا تھا۔ نند کے اور بھی چار بڑے بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ مگر بھائیوں میں سے دو مر گئے۔ ایک گوپال سنگھ بال بچوں کو چھوڑ کے شرابی ہو گیا تھا اور ایک حاکم سنگھ سادھوں کے ڈیرہ میں جا بیٹھا تھا۔ اس لیے نند کا سارا موہ اپنی بہن ہاکو کے ساتھ پڑ گیا تھا۔ بہن بڑی تھی، انتہائی حسین۔ جب بیاہی تو اپنے خاوند بلا سنگھ کو دیکھ کر ایک ہی ضد پکڑ لی کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ مکلاوے پھیرے جانے کے بجائے اس نے میکے گھر میں ایک نہ خانہ بنوایا اور چلے رکھ لیے۔ گلے میں گیروئے کپڑے ڈالتی۔ رات کو کچے چنے پانی میں بھگوتی اور دن میں چبا لیتی۔ نند نے بھی بہن کی دیکھا دیکھی گیروئے کپڑے پہن لیے تاہم بہن زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی۔ اس کی موت سے نند کو لگا کہ دنیا سے اصلی براگ اس کو اب ہوا تھا۔ وہ متمول نانا سردار امر سنگھ سچدیو سے ملی ہوئی لاانتہا جائیداد کو چھوڑ کر سنت دیال کے ڈیرہ میں جا بیٹھا۔ سنسکرت سیکھی، برج بھاشا سیکھی اور حکمت سیکھی، اور ڈیرے میں بال سادھو کہا جانے لگا۔ بہن جب زندہ تھی، ماما مامی نے نند کی کہیں امرتسر منگنی کی تھی۔ نند نے وہ رشتہ چھوڑ دیا اور براگ سے بھری نظمیں لکھنے لگا۔

راج بی بی مانگہ ضلع گجرات کی تھی، بے ٹے سے میں بیاہی ہوئی۔ جس کے ساتھ بیاہی تھی، وہ فوج میں بھرتی ہو کر گیا تھا۔ پھر اس کی کوئی خبر نہ آئی تھی۔ اداس اور دل شکستہ، وہ گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے سکول میں پڑھاتی تھی۔ سکول جانے سے قبل اپنی بھابھی

کے ساتھ دیال جی کے ڈیرے ماتھا ٹیکنے آئی تھی۔ بھائی فوت ہوگیا تھا۔ بھابی بیوہ تھی۔ اسی بھابی کے بتڑ میں وہ بھابی کے بھائی سے بیاہی تھی۔ لیکن اب دونوں اکیلی اور اداس ایک سکول میں پڑھاتی تھیں اور اکٹھی رہتی تھیں۔ ایک دن دونوں جب دیال جی کے ڈیرہ پر آئیں۔ موسلا دھار بارش اتر آئی۔ دیال جی نے بارش کا وقت گذارنے کے لیے اپنے بالکے سادھو کو نظم سنانے کے لیے کہا۔ وہ سدا آنکھیں موند کے نظم سنا کرتے تھے۔ اس روز جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا ــــــ ان کے نند کی آنکھیں راج بی بی کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ کچھ دن کے بعد انہوں نے راج بی بی کی داستانِ غم سنی اور نند سے کہا "بیٹا نند! جوگ تمہارے لیے نہیں۔ یہ بھگوے کپڑے اتار دو اور گرہستھ آشرم میں پاؤں رکھو۔" ــــــ یہی راج بی بی میری ماں بنی اور نند سادھو میرے پتا۔ نند نے دنیوی زندگی میں قدم رکھا، اپنا نام کرتار سنگھ رکھا۔ نظم کہتے تھے، اس لیے ایک تخلص بھی تھا، ہیوکھ! ــــــ دس سال بعد جب میں پیدا ہوئی تو انہوں نے ہیوکھ لفظ کو پنجابی میں الٹا کر میرا نام امرت رکھ دیا اور اپنا تخلص ہنکاری!

فقیری اور امیری دونوں کا میرے والد کے مزاج میں امتزاج تھا۔ ماں بتلایا کرتی تھی ــــــ ایک بار ان کا ایک گورو بھائی، (سنت دیال جی کا ایک اور مرید) سنت سرنام سنگھ کہنے لگا کہ اس کا بڑا بھائی شادی کرانا چاہتا ہے لیکن اچھا بھلا رشتہ ہوتے رہ گیا ہے کہ اس کے پاس رہنے کو اپنا مکان کوئی نہیں۔ والد کے پاس بھی بھی اپنے نانا کی جائداد میں سے ایک مکان بچا ہوا تھا۔ کہنے لگے "اگر اتنی سی بات کے لیے بیاہ نہیں ہوتا تو میں اپنا مکان اس کے نام لکھے دیتا ہوں۔" اور اپنا اکلوتا مکان اس کے نام لکھ دیا۔ پھر ساری عمر کرائے کے مکانوں میں رہے، اپنا مکان نہیں بنا سکے لیکن میں نے کبھی ان کے چہرے پر ملال نہیں دیکھا۔

لیکن میں نے ان چہرے پر اک بہت گہرا لال دیکھا ــــــ دس برس کی تھی، ماں نے داغِ جدائی دے گئی۔ وہ زندگی سے پھر بے نیاز ہوگئے۔ لیکن میں ان کے لیے ایک بہت بڑا بندھن تھی۔ موہ اور بیراگ دونوں ان کو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے۔ کئی لمحے ایسے بھی آتے ــــــ میں بلک پڑتی۔ پتہ نہیں لگتا تھا، میں ان کو منظور تھی کہ نامنظور ..... اپنا وجود ــــــ بیک وقت چاہا اور ان چاہا لگتا۔ . . قافیہ اور ردیف کا حساب

سمجھا کر والد نے چاہا تھا کہ میں لکھوں۔ لکھتی رہی میرا خیال ہے، والد کی نظر میں جتنا کچھ اُن چاہی تھی، وہ بھی چاہی بننے کے لیے۔

آج نصف صدی بعد سوچتی ہوں ——— فقیری اور امیری، دونو، بیک وقت میرے مزاج میں ہیں اور یہ مزاج اپنے نقوش کی مانند مجھے والد سے ملا ہے، شاندان کی نظر بھی میرے نظر میں شامل ہے ——— کبھی بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں اپنی نظروں میں منظور ہوں کہ نہیں! ——— شائد اسی لیے ساری عمر لکھتی رہی کہ میری نظروں میں جو کچھ میرا اَن چاہا ہے، وہ سارا میرا چاہا بن جائے . . . . جیسے اس وقت بھی دنیا کو نہیں سوچتی تھی، صرف سوچتی تھی کہ میرے والد مجھ سے خوش ہوں، آج بھی دنیا کی فکر نہیں کرتی، فکر کرتی ہوں صرف یہ کہ میرا اپنا آپ مجھ سے خوش ہو . . . . والد کے رو برو کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، اپنے آپ سے بھی نہیں بول سکتی . . . .

یہ ایک وہ پل ہے ——— جب گھر میں تو نہیں لیکن رسوئی میں نانی کی حکومت ہوتی تھی۔ سب سے پہلی بغاوت میں نے اس کی حکومت میں کی تھی۔ دیکھتی تھی باورچی خانہ کی ایک پڑچھتی پر تین گلاس، باقی برتنوں سے الگ تھلگ، ہمیشہ ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔ یہ گلاس صرف اس موقعہ پر زیریں چھت سے اتارے جاتے تھے جب والد کے مسلمان دوست آتے تھے اور ان کو لسی چائے پلانا ہوتی۔ اور اس کے بعد مانجھ دھو کر پھر وہیں رکھ دیئے جاتے تھے۔ سو تین گلاسوں کے ساتھ میں بھی چوتھے گلاس کی طرح شامل ہو گئی اور ہم چاروں نانی کے ساتھ لڑ پڑے۔ وہ گلاس بھی باقی برتنوں کو نہیں چھو سکتے تھے، میں نے بھی ضد پکڑ لی کہ میں کسی دوسرے برتن میں نہ پانی پیوں گی، نہ دودھ چائے۔ نانی ان گلاسوں کو الگ رکھ سکتی تھی مگر مجھ کو بھوکا پیاسا نہ رکھ سکتی تھی، اس لیے بات والد تک پہنچ گئی۔ والد کو اس سے قبل معلوم نہ تھا کہ کوئی گلاس اس طرح علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ ان کو پتہ چلا تو میری بغاوت کامیاب ہو گئی۔ پھر نہ کوئی برتن ہندو رہا نہ مسلم۔ اس گھڑی نہ نانی کو معلوم تھا نہ مجھ کو، کہ بڑی ہو کر زندگی کے کئی سال جس کے موہنہ کو عشق کروں گی، وہ اسی مذہب کا ہوگا جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت بنا دیئے جاتے تھے۔

ہونہار کا مونہہ ابھی تک نہیں تھا، لیکن سوچتی ہوں، اس پل شائد اسی کا سایہ تھا جو بچپن میں دیکھا تھا. . . . سائے بہت بڑی حقیقت ہوتے ہیں۔ مونہہ بھی حقیقت ہوتے ہیں۔ لیکن کتنی دیر؟ سائے اتنی دیر آپ چاہیں۔ چاہیں تو ساری عمر. . . . سال آتے ہیں، گذر جاتے ہیں، کمرے نہیں ہوتے۔ مگر کئی سائے، جہاں کبھی کمرے ہوتے ہیں، وہیں کمرے رہتے ہیں. . . .

یوں تو ہر سایہ کسی وجود کی پرچھائیں ہوتی ہے، وجود کی محتاج۔ لیکن کئی سائے اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جو اس قاعدے سے باہر ہوتے ہیں، وجود سے بھی آزاد۔ اور یوں بھی ——— کہ ایک سایہ معلوم نہیں کہاں سے، اور کس وجود سے ٹوٹ کر آپ کے پاس آجاتا ہے اور آپ اس سائے کو لے کر دنیا میں گھومتے رہتے ہیں اور ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ یہ جس وجود سے ٹوٹا تھا، وہ کون سا ہے؟ مغالطوں کا کیا ہے، پڑ جاتے ہیں۔ آپ یہ سایہ غیروں کے گلے کے ساتھ بھی لگا کر دیکھتے ہیں، کیا پتہ ناپ کا ہو؟ نہیں ہوتا، نہ سہی۔ آپ پھر اس کو، اندھیرے سے کو، پکڑ کر وہاں سے چل پڑتے ہیں۔

میرے پاس بھی ایک سایہ تھا۔ نام کا کیا ہوتا ہے، اس کا ایک نام بھی رکھ لیا تھا ——— راجن! گھر میں قاعدہ تھا کہ سوتے وقت، کیرتن سوہلا کا پاٹھ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے لیے والد کا اعتقاد تھا کہ، جوں جوں اس کی سطریں پڑھتے جاؤ، آپ کے گرد ایک قلعہ تعمیر ہوتا جاتا ہے اور پاٹھ کے ——— پورا ہوتے ہی آپ ساری رات ایک قلعے کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ پھر ساری رات باہر سے کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اس قلعے میں داخل ہو سکے۔ اس لیے آپ سب طرح کے افکار سے آزاد ہو کر ساری رات سوتے ہیں۔ یہ پاٹھ سوتے وقت کرنا ہوتا تھا۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوتی تھیں، اتنی کہ نیند کے غلبہ میں یہ ادھورا بھی رہ سکتا تھا۔ سو اس بارے میں ان کا کہنا تھا کہ آخری جملہ تک یہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر آخری جملات بھی چھٹک جائیں تو قلعہ بندی میں کوئی درز فاصلہ رہ جاتا ہے جس لیے وہ پوری حفاظت نہیں دے سکتا۔ سو آخری تک تک یہ پاٹھ کرنا ہوتا تھا۔ بہت بچی تھی، فکر لاحق ہوا کہ اس پاٹھ کے بعد میرے

گرد قلعہ تعمیر ہو جائے گا تب پھر راجن میرے خوابوں میں کیسے آئے گا؟ میں قلعہ کے اندر ہوں گی، وہ قلعہ کے باہر ہو گا..... سوچا کہ پاٹھ زبانی یاد ہے، اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ہولے ہولے کرنا ہے۔ میں یاد سے اس کی کچھ سطریں چھوڑ جایا کروں گی، قلعہ پوری طرح بند نہیں ہو گا اور اس کھلی رہ گئی درز میں سے وہ اندر آجایا کرے گا۔

لیکن والد نے اس قاعدہ کی صورت بدل دی۔ اس کے بجائے کہ سب اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اپنا اپنا پاٹھ کریں، انہوں نے قاعدہ بنا دیا کہ میں اپنی چارپائی پر بیٹھ کر بلند آواز میں پاٹھ کروں گی اور سب اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اس کو سنیں گے۔ یہ شاید اس لیے کہ دور رشتے میں سے ایک لڑکا اور ایک چھوٹی سی بچی والد کے پاس ہی رہتے اور پڑھتے تھے اور اس چھوٹی بچی کو یہ پاٹھ یاد نہ ہوتا تھا۔ سو پاٹھ کی کوئی بھی سطر چھوڑی نہیں تھی جا سکتی۔ ایک دو بار چھوڑنے کی کوشش کی لیکن والد نے بھول کو درست کروا کر وہ سطریں بھی پڑھوا لیں۔ پھر بڑی سوچ بچار کے بعد یہ حل نکالا کہ کیرتن سوہلا کا پاٹھ کرنے سے پہلے میں راجن کو یاد کر کے اس کو اپنے پاس بلا لیا کروں تاکہ وہ قلعے کی دیواروں کی تعمیر سے پہلے ہی قلعے کے اندر آجایا کرے۔

اس وقت دس برس کی تھی۔ اب چالیس برس بعد اس بات کو سوچتی ہوں تو لگتا ہے، جس ہستی کے لیے یہ لگن تھی، وہ بیکار نہیں گئی۔ گرد حفاظتی قلعے بنے بھی ہیں اور ٹوٹے بھی، لیکن اس کا وجود کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے ـــــ کبھی انسانی موہنہ کی شکل میں، کبھی قلم کی صورت میں۔ اور کبھی خدا کی ذات کی طرح واحد سے بے حد ہوتا ـــــ کسی کتاب کے صفات میں سے بھی ابھرا ہے اور کسی کینوس میں سے بھی نکل کر باہر اتر آتا ہے۔ اور دھوئیں کی لکیروں میں سے جن کے ظاہر ہونے کی مانند یہ کبھی کسی گیت کے بول میں سے بھی نکلتا ہے۔ کسی پھول کی کھلتی پنکھڑی میں سے بھی، اور سمندر کے پانیوں میں ہلتے ہوئے چاند کے سائے میں سے بھی۔ اور سخت تنہائی کے وقت یہ دریاؤں کو چیر کر بھی ملا ہے ـــــ میرے جسم کی رگوں میں بہتے خون کے دریاؤں کو چیر کر۔ اور اس کے وجود سے بیزاری کا زرد رنگ بھی سرخ ہو جاتا ہے۔

یہ ـــــ اب گوشت پوست سے زیادہ وجود ہے کہ رنگوں اور خوشبوؤں میں سے گزرتا، فکروں اور خوابوں کی اس حد تک ہمہ گیر ہو گیا ہے جہاں کسی راہگزر کی چھوٹی سی اچھائی بھی اس کا وجود معلوم ہوتی ہے، اور آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔

میرے لیے غیر جسمی کچھ نہیں۔ ہر شے کا وجود گوشت پوست کی طرح ہے جس کو ہاتھ سے چھو سکتی ہوں، جو میرے جسم سے گزر سکتا ہے۔ چھوٹی عمر میں، جب گورو ہرگوبند جی یا گورو گوبند سنگھ کا خواب آتا تھا، میں ان کے گھوڑے کو، باز کو، یا گلے میں پڑی تلوار کو ہمیشہ ہاتھ سے چھو کر دیکھتی تھی، دور سے سجدہ کر کے نہیں! اسی طرح پھولوں اور پتیوں کی ٹہنیاں میں بانہوں میں بھر لیتی تھی، اب بھی کسی سے گلے ملنے کی طرح۔ سارا جسم لرز جاتا ہے اور ان کے کساؤ سے میرے سانس گرم ہو جاتے ہیں۔ بڑے سالوں کی بات ہے۔ ایک بار کوئی پاس بیٹھا تھا۔ اس کی جیب کا رومال میلا تھا۔ اس کو رومال کی ضرورت پڑی تو نیا دے کر اس کا میلا رومال لے لیا، پاس رکھ لیا۔ وہ بڑے سال میرے پاس رہا۔ جب کبھی اس رومال کو ہاتھ لگاتی تھی تو پیشانی کی رگیں سلگ جاتی تھیں۔

کوئی بیج جانے کیسے ہوتے ہیں۔ ایک بار خون اور گوشت میں آگ آئیں تو پھیر چاہے کیسی آندھیاں چلیں، سوکھے پڑیں، ان کے پتے جھڑ جائیں، ٹہنیاں ٹوٹ جائیں، لیکن وہ جڑوں سے نہیں اکھڑتے۔ ایک "کسی چہرے کا تصور" اور دوسرا "الفاظ کا ادب" اس قسم کے بیج تھے جو بالپن کی عمر میں میرے اندر سے اگ پڑے۔ بھیم انتقاد ٹوٹے۔ یوں ٹوٹے کہ سوچتی ہوں ـــــ یہ درخت تو جڑوں سے اکھڑ جانے چاہیے تھے۔ کبھی محسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کا کوئی نام و نشان نہیں رہا۔ لیکن دل کی خشک مٹی میں سے پھر ان کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں، ان کو بور پڑ جاتا ہے اور میرے سانسوں میں ان کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان آسیبی پیڑوں کا ایک بیج میں نے اپنے ہاتھ سے بویا تھا لیکن دوسرا میرے والد نے۔ کسی کتاب کا ورق زمین پر پڑا ہوتا، وہ ادب سے اٹھا لیتے۔ اگر کہیں بھول سے میرا پاؤں اس ورق پر آ جاتا تو وہ خفا ہوتے۔ سو حروف کا ادب دل میں بیٹھ گیا اور ساتھ ہی ان کا جن کے ہاتھ میں قلم ہوتی تھی۔ دیکھتی تھی یوں ہی تھی ۔۔۔ معانی کا حسن شاید تب والد نے درست

تھے۔ وہ جب کبھی آتے ـــــ گھر کی دہلیز یں بھی ادب سے معمور ہو جاتیں۔ والد کے گورو، سنسکرت کے عالم دیال جی کی تصویر ہمیشہ والد کے سرہانے کی طرف لگی ہوتی تھی۔ اس کی طرف پاؤں کرنا بھی منع تھا۔ اس لیے بڑی ہوئی تو اپنے ہمعصروں کے لیے بھی میرے پاس ادب تھا لیکن اپنے ہمعصروں سے جتنے اداس تجربے ہوئے ہیں، حیران ہوں، حرفوں اور قلموں کے ادب کا آسیبی درخت جڑوں سے کیوں نہیں سوکھ گیا! یوں سوچتی ہوں ـــــ جیسے ہم عصر صرف دہا ئیں جن کے ساتھ واسطہ پڑا؟ وقت اور فاصلہ کی حدود سے پرے بھی کوئی ہیں، کتنے ہی کازان زاکس، جنہوں نے میرے اس حرفوں اور قلموں کے ادب والے پیڑ کو سینچا ہے۔ پھر وہ پیڑ بھی اگر سرسبز رہ گیا ہے تو حیران کیوں ہوں!

۳۱ جولائی ۱۹۳۰ء

بہ مشکل گیارہ سال کی تھی، جب اچانک ایک دن ماں بیمار ہو گئی۔ بیماری کچھ ہفتہ بھر لمبی ہوئی تھی، جب میں نے دیکھا، ماں کی چارپائی کے گرد بیٹھے سب کے موبنہ گھبرائے ہوئے تھے۔ میری بیٹا کہاں ہے؟ کہتے ہیں، ایک بار ماں نے پوچھا تھا اور جب ماں کی سہیلی پریتم کور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ماں کے پاس لے گئی، ماں کو ہوش نہیں تھا۔ "تم خدا کا نام لو تو، شائد اس کے دل میں مہر پڑ جائے۔ وہ بچوں کا کہنا نہیں موڑتا۔۔۔" میری ماں کی سہیلی، میری موسی نے مجھ سے کہا۔ ماں کے بستر کے پاس کھڑے میرے پاؤں پتھر ہو گئے۔ مجھے کئی برسوں سے پرماتما کے ساتھ دھیان جوڑنے کی عادت تھی۔ اور اب جبکہ ایک سوال بھی سامنے تھا، خیال جوڑنا دشوار نہیں تھا۔ میں نے پتہ نہیں، کتنی دیر خیال جوڑے رکھا اور رب العزت سے کہا۔۔۔۔ "میری ماں کو نہ مارنا!"

ماں کے بستر سے اب ماں کے درد سے کراہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ارد گرد بیٹھے ان لوگوں میں ایک گھبراہٹ پھیل گئی تھی۔ مجھے لگتا رہا، "یونہی سب گھبرا رہے ہیں۔ اب ماں کو درد نہیں ہو رہا۔ میں نے خدا کو اپنی بات کہہ لی ہے، وہ بچوں کا کہنا نہیں ٹالتا!"

اور پھر ماں کی چیخوں کی آواز نہ آئی لیکن سارے گھر کی چیخیں نکل گئیں۔ میری ماں مر گئی تھی۔

اس روز میرے دل میں ایک غیظ ابل پڑا ـــــــ "خدا کسی کی نہیں سنتا، بچوں کی بھی نہیں..."
یہ وہ دن تھا جس دن کے بعد میں نے اپنا برسوں کا معمول چھوڑ دیا۔ والد کا حکم سخت ہوتا تھا، لیکن میری ہٹ نے اس کے ساتھ ٹکر لے لی ۔

"رب کوئی نہیں ہوتا۔"

"یوں نہیں کہا کرتے۔"

"کیوں؟"

"وہ ناراض ہو جاتا ہے۔"

"تو ہو جائے۔ مجھے پتہ ہے، رب کوئی نہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"

"اگر وہ ہوتا تو میری بات نہ سنتا!"

"تم نے اس کو کیا کہا تھا؟"

"میں نے اس سے کہا تھا، میری ماں کو نہ مارنا۔"

"تم نے اس کو کب دیکھا تھا؟ وہ دکھائی تھوڑے دیتا ہے؟"

"لیکن اس کو سنائی بھی نہیں دیتا!"

پوجا پاٹھ کے لیے والد کا حکم اپنی جگہ اٹا ہوا تھا اور میری ہٹ اپنی جگہ پر کبھی ان کا غصہ زیادہ ہی مشتعل ہو جاتا اور وہ مجھ کو چوکڑی مروا کر بٹھا دیتے "دس منٹ آنکھیں بند کرکے رب کو یاد کرو!" بظاہر جب جسمانی طور پر میری کرنی ان کے حق ولدیت سے ٹکر نہ لے سکتی، میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی، آنکھیں بھی موند لیتی، لیکن اپنی شکست کو اپنے دل کا غضب بنا لیتی ـــــــ "اب آنکھیں میچ کر اگر میں خدا کو یاد نہ کروں تو وہ میرا کیا کر لیں گے؟ جس خدا نے میری وہ بات نہیں سنی، اب میں نے اس کو کبھی کچھ نہیں کہنا۔ اس کا تصور بھی نہیں لانا۔ اب میں آنکھیں موند کر اپنے راجن کا چہرہ سوچوں گی۔ وہ میرے ساتھ خوابوں میں کھیلتا ہے، میرے گیت سنتا ہے، وہ میری تصویر بناتا ہے۔ بس اسی کو سوچوں گی۔ اسی کو......"

یہ وہ دن تھے، جن کے بعد میں نے کئی دن نہیں، کئی مہینے نہیں، کئی سال دو سپنوں میں بتا دئے۔ روز رات کو میرے پاس آنا ان سپنوں کا معمول بن گیا۔ گویا ہو یا

بردی، انہوں نے حتی الوسع ناغہ نہیں ڈالا۔ ایک سپنا تھا کہ ایک بڑا سا قلعہ ہوتا۔ اور لوگ مجھے اس قلعہ میں بند کر دیتے۔ اندر سے دروازہ کوئی نہ ملتا۔ میں قلعہ کی دیواروں کو انگلیوں سے ٹٹولتی رہتی لیکن پتھر کی دیواروں کی کوئی جگہ نہیں نہی پگھلتی۔ سارا قلعہ کھوند کھوند کر جب کوئی دروازہ نہ ملتا، میں سارا زور لگا کر اڑنے کی کوشش کرنے لگتی۔ میری باہوں کا اتنا زور لگتا۔ اتنا زور کہ میرا دم پھول جاتا۔ پھر میں دیکھتی۔ میرے پاؤں زمین سے اوپر کی طرف اٹھنے لگ جاتے۔ میں اوپر اٹھتی جاتی، اور اوپر، اور پھر قلعے کی دیوار سے بھی اونچی ہو جاتی۔ سامنے عرش آجاتا۔ اوپر سے میں نیچے نگاہ ڈالتی۔ قلعے کا پہرہ دینے والے لوگ گھبرائے ہوتے۔ غصہ و غضب سے بازو پھیلاتے۔ لیکن مجھ تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ پاتا...... اور دوسرا سپنا تھا——لوگوں کا ایک ہجوم میرے تعاقب میں ہوتا۔ میں پاؤں کی ساری قوت کے ساتھ دوڑتی۔ لوگ میرے پیچھے بھاگتے۔ فاصلہ کم ہوتا جاتا۔ میری گھبراہٹ بڑھتی جاتی۔ میں اور زور لگاتی، اور زور، اور سامنے دریا آجاتا۔ میرے تعاقب میں آرہے ہجوم میں مسرت پھیل جاتی۔ "اب آگے کہاں جائے گی؟ آگے کوئی راستہ نہیں۔ آگے دریا بہتا ہے......" اور میں دریا کے اوپر چلنے لگ جاتی۔ پانی کی روانی قائم رہتی، لیکن جیسے اس میں زمین کا سا آسرا آجاتا۔ زمین بلکہ پاؤں کو سخت لگتی ہے۔ پانی ملائم لگتا۔ اور میں چلتی جاتی۔ ساری بھیڑ کنارے پر رک جاتی۔ کوئی پانی میں پاؤں نہ ڈال سکتا۔ اگر کوئی ڈالتا، ڈوب جاتا۔ اور کنارے پر کھڑے لوگ گھور گھور کر تکتے، پیچ و تاب کھاتے، لیکن کسی کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ پایا۔

میرا سولھواں سال

سولھواں سال آیا——ایک اجنبی کی طرح۔ پاس آکر بھی ایک فاصلہ پر کھڑا رہا میں کبھی چپکے سے اس کی جانب دیکھ چھوڑتی۔ وہ کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھ چھوڑتا۔ گھر میں باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ تھا مصنف باپ، جس نے ساری رات جاگتے رہنا، لکھنا، اور پھر سارا دن سوتے رہنا۔ ماں زندہ ہوتی تو سولھواں سال شاید اور طرح آتا —— واقف کاروں کی طرح، سہیلیوں اور دوستوں کی طرح، رشتہ داروں کی طرح۔ لیکن ماں کی غیر حاضری کی وجہ سے زندگی تب سے بڑا کچھ غیر حاضر ہو گیا تھا۔ اردگرد کے

اپنے بُرے اثرات سے بچانے کے لیے باپ کو اسی میں حفاظت معلوم ہوتی تھی کہ میرا کوئی شناسا نہ ہو۔ نہ سکول کی کوئی لڑکی، نہ پڑوس کا کوئی لڑکا۔ سولھواں سال بھی اسی گنتی میں شامل تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی لیے وہ سیدھی طرح گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آیا تھا، چوروں کی مانند آیا تھا۔ وہ کبھی کسی رات میرے سرہانے کی کھلی کھڑکی میں سے چپ چاپ میرے خوابوں میں آ جاتا یا کبھی دن کے وقت۔ جب میرے والد کو سویا دیکھتا، تو وہ گھر کی دیوار پھلانگ کر آ جاتا اور میرے کمرے کے گوشے میں لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے میں آ کر بیٹھ جاتا۔

گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی کتب کی فضا مذہبی تھی، سادھی میں گم سے رشیوں کی مانند۔ تاہم کئی تاریخی تصانیف کی فضا اس قسم کی بھی تھی جن میں کسی مینکا یا اُروشی کے آنے سے رشیوں کی سادھی ٹوٹ جاتی تھی۔ یہ دوسری قسم کی کتابیں اس طرح کی تھیں جن کو پڑھتے ہوئے ان کی کسی سطر میں سے نکل کر اچانک میرا سولھواں سال میرے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا ____ لگتا تھا، یہ سولھواں سال بھی جیسے کسی اپسرا کا روپ تھا جو میرے سادہ لوح بچپن کی سمادھی بھنگ کرنے کے لیے کبھی اچانک میرے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا.... کہتے ہیں ____ ہر اپسرا، جو کسی نہ کسی رشی کی سمادھی بھنگ کرنے آئی تھی، راجہ اندر کی سازش ہوتی تھی۔ میرا سولھواں سال بھی ضرور قدرت کی سازش ہو گی کیونکہ اس نے میرے سیدھے سادے بچپن کی سمادھی توڑ دی تھی۔ میں نظمیں لکھنے لگ گئی تھی۔ اور ہر نظم مجھے خواہشِ ممنوعہ ایسی لگتی تھی۔ کسی رشی کی سمادھی ٹوٹ جانے تو بھٹکتے رہنے کا شراپ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، فکر و غور کا شراپ میرے پیچھے پڑ گیا....

لیکن سولھویں سال کے ساتھ میرا طبعی رشتہ نہ تھا۔ چوری کا تعلق تھا۔ اس لیے وہ بھی میری طرح، میرے والد کے سامنے سہم جاتا تھا۔ اور مجھ سے دور ہٹ کر کسی دروازے کے پیچھے سا کھڑا ہوتا تھا۔ اور اس کو چھپائے رکھنے کے لیے میں ایک پل جو من مرضی کی نظم لکھتی تھی، دوسرے پل پھاڑ دیتی تھی۔ اور والد کے سامنے پھر سیدھی سادی الہ فرمانبردار بچی بن جاتی تھی۔ میرے والد کو میرے نظم لکھنے پر اعتراض نہ تھا بلکہ قافیہ ردیف کی بات مجھ کو میرے والد نے سکھائی تھی، صرف تقاضا یہ تھا کہ میں مذہبی نظمیں لکھوں۔ اور میں فرمانبردار بچی کی طرح وہی دقیانوسی نظمیں لکھ دیتی تھی۔ عمر کے سولھویں

سال میں ہر اعتقاد روانتی ہوتا ہے۔ اور اس لیے دقیانوسی بھی، یوں سولھواں سال آیا اور چلا گیا۔ ظاہرہ طور پر کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اصل میں یہ سال عمر کی سڑک پر لگا ہوا خطرے کا نشان ہوتا ہے ـــــــ اگر گذرے سالوں کی ہموار سڑک ختم ہو گئی ہے، آگے سے اونچی نیچی اور بھیانک موڑوں والی سڑک شروع ہو گی۔ اور اب ماں باپ کی نصیحت سے لے کر، سکول کے درس یاد کرنے، وعظ کو سننے ماننے اور سماجی بناوٹ و تشکیل کو احترام سے قبول کرنے تک کے بھولے بھالے اعتقاد کے سامنے ہر وقت ایک سوالیہ فقرہ آ کھڑا ہو گا۔۔۔۔۔ اس سال میں جانا پہچانا سب کچھ تن کے کپڑوں کی مانند تنگ ہو جاتا ہے۔ ہونٹ زندگی کی پیاس سے خشک ہو جاتے ہیں، آسمان کے ستارے، جن کو سپنت رشیوں کی صورت میں دیکھ کر دور سے پرنام کی جاتی تھی، قریب جا کر چھونے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔ اردگرد اور دور و نزدیک کی ہوا میں اتنی ممانعتیں اور انکار ہوتے ہیں اور اتنی مخالفت کہ سانسوں میں آگ سلگ پڑتی ہے۔۔۔

جس حد تک یہ سب کے ساتھ پیش آتا ہے، میرے ساتھ اس سے تین گنا بڑھ کر ہوا۔ ایک، اردگرد کا متوسط طبقے کا پھیکا اور رسمی رہن سہن، ایک ماں کی عدم موجودگی کے سبب ہر وقت ممانعتوں کی چہار دیواری اور ایک والد کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت میں، میرے اوپر بھی انتہائی نظم و ضبط میں رہنے کی پابندی۔ اس لیے سولھویں برس سے میری واقفیت اس ناکام محبت ایسی تھی، جس کی کسک ہمیشہ کے لیے کہیں چپکی رہ جاتی ہے۔ اور شاید اسی لیے وہ سولھواں سال بھی، اب میری زندگی کے ہر سال میں کہیں نہ کہیں شامل ہے۔۔۔

اس کے غصہ غضب کا بھیانک روپ میں نے اس کے بعد کئی بار دیکھا۔ ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کے وقت بھی دیکھا تھا، سماجی، مذہبی اور سیاسی اقدار کانچ کے برتن کی مانند ٹوٹ گئی تھیں۔ اور ان کے کنکر لوگوں کے پاؤں میں چبھے ہوئے تھے۔ یہ کنکر میرے پاؤں میں بھی چبھے تھے اور میری پیشانی میں بھی بزندگی کا موہنہ دیکھنے کی تڑپ میں، میں نے اسی تپش کے ساتھ نظمیں لکھیں، جس تپش کے ساتھ کوئی سولھویں برس میں اپنے محبوب کا چہرہ ڈھونڈنے کے لیے لکھتا ہے۔ اور پھر اسی طرح پڑوسی ملکوں کے حملے کے وقت، ویت نام کی طویل جدوجہد کے وقت، چیکوسلواکیہ کی مجبوری کے وقت۔۔۔

میرا خیال ہے کہ جب تک آنکھوں میں کوئی حسین تصور قائم رہتا ہے اور اس تصور کی راہ میں جو کچھ بھی غلط ہے، اس کے ساتھ غصہ و غضب قائم رہتا ہے، اس وقت تک آدمی کا سولھواں سال بھی قائم رہتا ہے۔ خدا کی ذات کی طرح ہر صورت میں، حسین تصور ایک محبوب کے چہرے کا ہو یا زمین کے چہرے کا، اس میں فرق

نہیں۔ یہ دل کے سولھویں سال کے ساتھ دل کے تصور کا رشتہ ہے۔ اور میرا یہ رشتہ ابھی قائم ہے۔۔۔

خدا کی جس سازش نے یہ سولھواں سال کسی اپسرا کی طرح بھیج کر میرے بچپن کی سادھی بھنگ کی تھی، اس سازش کی میں زیر بار ہوں کیونکہ اس سازش کا تعلق صرف ایک سال کے ساتھ نہیں تھا، میری عمر کے ساتھ ہے۔ میری ہر سوچ اب بھی کچھ کچھ وقفہ کے بعد میرے سیدھے سادے دنوں کی سمادھی توڑتی ہے۔ صبر و شکر کے ساتھ زندگی کی غلط قدروں سے کی ہوئی صلح اس سادھی کی مانند ہوتی ہے، جس میں عمر کا حاصل چلی جاتی ہے، اور میں خوش ہوں، میں نے سادھی کے چین کا ورنہیں پایا۔ اضطرار و بیقراری کا سراپ پایا ہے۔۔۔ اور میرا سولھواں سال آج بھی میرے ہر سال میں شامل ہے۔۔۔ صرف اب اس کا چہرہ اجنبی نہیں رہا، سب سے زیادہ شناسا ہو گیا ہے۔ اور اب اس کو چوری چھپے دیواریں پھاند کر آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ ہر مخالفت کو سرعام چیر کر آتا ہے۔ صرف بیرونی مخالفت کو نہیں، میری عمر کے پچاسویں سال کی مخالفت کو بھی روند کر ۔۔۔۔ اور اس کی سبھی علامتیں اب بھی اسی طرح ہیں ــــــ اب بھی ارد گرد کا سب کچھ، تن کے کپڑوں کی مانند روح کو تنگ لگتا ہے، ہونٹ زندگی کی پیاس سے خشک ہو جاتے ہیں ہر شش کے ستاروں کو ہاتھ سے چھونے کو دل چاہتا ہے، اور کوئی بے انصافی چاہے دنیا میں کسی کے ساتھ، اور کہیں بھی واقع ہو، اس کے خلاف میرے سانسوں میں آگ سلگ پڑتی ہے۔۔۔

ایک سایہ

ایک سرمئی سا سایہ تھا جو چلنا سیکھا تو ساتھ چل پڑا تھا۔ لیکن ہوتے ہوتے پتہ چلا کہ اس میں بہت کچھ آمیز ہو رہا ہے ـــــ اپنے محبوب کا مونہہ بھی، اور اپنا مونہہ بھی جو ابھی صرف میری تمنا تھی ـــــ میرے سے کہیں زیادہ دانا، سنجیدہ اور توانا۔ اور اس کے علاوہ اپنے ملک اور ہر ملک کے انسان کا آزاد مونہہ بھی۔ جو کچھ تکتی رہی ـــــ اسی ہڈیوں کے ڈھانچے کو خون اور گوشت دینے کی چاہ میں تکتی رہی، اس کے سرمئی رنگ میں نورانی آب بھرنے کی تمنا میں تکتی رہی۔ یہ ایک طرح سے خدا کو زمین پر اتار لینے کی تمنا تھی۔

شاید اسی سبب یہ ایک موہنہ تک محدود نہیں رہا۔ جہاں کہیں بھی حسن کا ذرہ ہے، وہاں تک وسعت اختیار کر گیا۔

یہ وہی میں ہے، جس کے لیے لکھا تھا بہت ہم عصر ہیں، صرف ایک میں میرا ہم عصر نہیں ...... یہ ایک محض تھا، پرندے کے گیت ایسا۔ ایک پل ہوا میں، اگلے پل کہیں بھی نہیں۔ جس کان نے سن لیا، ٹھیک ہے، انہیں سنا، تو بھی ٹھیک ہے۔ کسی کے کان پر نہ کوئی حق تھا نہ دعویٰ!

بہت تپتی تھی، جب متعجب ہوں کہ میرے گرد کتنی ہی آوازیں تھیں جو گالیاں بن گئی تھیں۔ کتنے ہی ناموں کے پرچم تھے، اور جھنڈے، جن میں وہ پرچم گڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ میں نے بھی وہاں اپنے نام کا کوئی پرچم گاڑنا ہے۔ کہنا چاہا ____ دوستو! تمہارے جھنڈے اور تمہارے علم تمہیں مبارک۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معاذاللہ نہ کھاؤ۔ لیکن دیکھا ____ کچھ کہنا سننا ممکن نہیں۔ سمجھا کہ وقتی بات ہے، کبھی تو ممکن ہو گی۔ مگر اپنی زبان کے ادیبوں کے ہاتھوں یہ کبھی ممکن نہیں ہوئی۔ نہ آج سے بیس برس پہلے، نہ آج۔

یہ میرا پہلا المیہ تھا، لیکن معلوم نہیں تھا کہ عمر جتنا طویل ہوگا۔ کچھ بزرگ چہرے تھے ____ گوربخش سنگھ جی، دھنی رام چاترک، پرنسپل تیجا سنگھ جو پیار سے، شاید رحم سے، مسکرائے تھے۔ لیکن ان میں سے دو چہرے بہت جلد بچھڑ گئے۔ اور گوربخش سنگھ جی، جو کچھ ادب میں بیتا تھا، اس سے بہت جلد لاتعلق ہو گئے۔ شاید بے لاگ۔

دل کی تہوں میں سب سے پہلا درد جس کے چہرے کی تابانی میں دیکھا، وہ اس مذہب کا تھا، جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت قرار دے دیئے جاتے تھے۔ یہی چہرہ تھا جو میرے اندر کے انسان کو اتنا فراخ بنا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہ ہو کر بھی، دونوں مذاہب کے ظلم، بنا کسی رعایت یا جانبداری کے تحریر کر سکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو "پنجر" ناول کی تقدیر جانے کیا ہوتی۔

بیس اکیس برس کی تھی، جب خیالی سی چہرہ اس زمیں پر دیکھا تھا (اس میل کو بہت سال بعد میں نے بہ تفصیل "آخری خط" میں لکھا تھا) یہ "شی" کی مانند روز آگ میں نہانے والی حالت تھی ____ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں جب اکادمی کا ایوارڈ ملا، فون پر خبر سنتے

تو سر سے پاؤں تک میں تاپ میں تپنے لگی ——— خدایا! یہ سنیہڑے میں نے کسی انعام
کے لیے تو نہ لکھے تھے جس کے لیے لکھے تھے، اس نے نہ پڑھے۔ اب کل عالم بھی
پڑھ لے تو مجھ کو کیا.... اس روز شام کے وقت ایک پریس نے رپورٹر بھیجا، فوٹوگرافر
بھی، وہ جب تصویر لینے لگا، اس نے کاغذ اور قلم کے ذریعے وہ لمحہ گرفت میں لینا چاہا
جو کسی نظم کا وقت تصنیف ہوتا ہے۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑ
کر کاغذ پر نظم لکھنے کے بجائے ——— ایک بے خودی کے سے عالم میں اس کا نام
لکھنے لگ گئی، جس کے لیے وہ سنیہڑے لکھے تھے ——— ساحر ساحر.... سارا کاغذ
بھر گیا۔ پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلی بیٹھی کو ہوش سی لوٹی ——— صبح کو اخبار میں تصویر
نکلے گی تو میز کے کاغذ پر یہ ساحر ساحر کی گردان.... اوہ خدایا! مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے
والی حالت میں نے اس روز اپنے جسم پر بنائی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کیمرے کا فوکس میرے
ہاتھ کے اوپر تھا، کاغذ پر نہیں۔ اس لیے دوسرے دن کے اخبار میں کاغذ پر سے کچھ نہیں پڑھا
جا سکتا تھا (کچھ نہیں تھا پڑھا جا سکتا۔ اس بات کی تسلی کے بعد ایک درد بھی اس میں شامل
ہو گیا ——— کاغذ خالی دکھائی دیتا ہے ——— لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ خالی نہیں تھا....

ساحر کو میں نے تھوڑا سا "اشو" ناول میں لکھا، پھر "ایک سی انیتا" میں۔ اور پھر
"دلّی دیاں گلیاں" میں ساگر کے روپ میں۔ نظمیں کئی لکھی تھیں، سنیہڑے سب سے طویل نظم،
چیتر نام کی ساری نظمیں، اور ایک آخری نظم "آگ دی ایہہ بات ہے، تو نے ایہہ بات
پائی سی".... لکھ کر لگا ——— کہ اب چودہ برس کا بن باس کاٹ کر آزاد ہو گئی تھی۔ لیکن
بیتے ہوئے سال ——— تن پر پہنے کپڑوں ایسے نہیں ہوتے۔ یہ جسم کے تل بن جاتے
ہیں۔ گو زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ جسم پر چپ چاپ پڑے رہتے ہیں۔ بڑے سالوں
بعد ——— بلغاریہ کے جنوب کی طرف "وارنا" کے مقام پر ٹھہری ہوئی تھی جس کے
ایک طرف سمندر تھا، ایک طرف جنگل، ایک طرف پہاڑ۔ وہاں ایک شب اول
لگا ——— جیسے سمندر کی جانب سے ایک کشتی آئی ہو، اور کشتی میں سے کوئی اتر کر
دریچے کی راہ سے ——— سالم کا سالم ——— میرے ہوٹل کے کمرے میں آ گیا ہو
.... ہوش و بے خودی مل سی گئیں۔ اس رات نظم لکھی تھی "تیریاں یاداں بہت دیر ہوئی
جلاوطن ہوئیاں...."

خاموشی کا ایک دائرہ

مڑ کر کئی میل پیچھے کی طرف دیکھوں تو ملک کی تقسیم سے پہلے کے وہ دن سامنے آتے ہیں، جب اچانک لاہور کی فضا ہولناک افواہوں سے تلخ ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ، میرے بیاہ کے سوا کچھ نہیں تھا بیتا۔ چار کے سن میں جو سگائی ہوئی تھی، وہ سولہ سال کی عمر میں پروان چڑھی، بڑی ہموار سی چلتی زندگی کی مانند۔ لیکن ادبی حلقوں میں بڑی رومانی کہانیاں پھیل گئیں۔ معلوم ہوا، پنجابی شاعری میں جس شاعر کا نام سب سے احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا، اس شاعر نے مجھ پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ اس زمانے کے مشہور شاعر موہن سنگھ کا نام تھا۔ لیکن جن مجالس میں میں نے موہن سنگھ جی کو دیکھا، ان سے معمولی سی ملاقات ہوئی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شائد ان کی فطرت ہی سنجیدہ اور متین تھی۔ اس لیے مجھے ان کے ساتھ کوئی شکوہ نہ تھا۔ لیکن اطراف میں اٹھتی کہانیوں سے میں خوش نہ تھی۔ میرے دل میں ان کے لیے اپنے سے عظیم شاعر ہونے کے ناطے، ایک احترام تھا، لیکن اس سے الگ کچھ نہیں تھا۔ میرا دل اپنی ہی تہ سے اٹھتے ہوئے سائے سے پُر ہو رہا تھا، اس لیے اردگرد کے افسانے صرف یہی خوف جگاتے تھے کہ میں ایک غلط فہمی کا مرکز بن رہی ہوں۔ تاہم موہن سنگھ جی کا خلوص اس قسم کا تھا کہ ان پر کوئی شکوہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ایک شام موہن سنگھ ملنے آئے، ان کے ساتھ شائد ڈاکٹر دیوان سنگھ تھے یا کوئی اور، اب مجھ کو یاد نہیں۔ اور معلوم ہوا اگلے دن انہوں نے نظم لکھی۔ "جائیداد" جس کے معنی تھے ــــــ وہ دروازے میں خاموش کھڑی تھی، ایک جائیداد کی مانند ایک مالک کی ملکیت کی مانند . . . . .

میرے لیے، یہ میرے دل کے بڑے مشکل دن تھے۔ نظم کی صاف بیانی مجھے بے چین کر رہی تھی ــــ کہ ایک چنگے بھلے آدمی کو میری خاموشی غلط فہمی میں ڈال رہی ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خاموشی کو میں کس طرح توڑدوں؟ ــــــ میرے سامنے موہن سنگھ جی نے اپنی خاموشی کبھی نہیں تھی توڑی۔ اس خاموشی کی ایک اپنی آبرو تھی، جو قائم تھی۔ اور پھر ایک روز موہن سنگھ آئے۔ ان کے ہمراہ فارسی کے عالم کپور سنگھ تھے۔ میرا تاثر اسی طرح قائم تھا جس میں احترام بھی شامل تھا لیکن شائد کچھ رکھائی بھی ہے کہ دفعتہً کپور

سنگھ جی بول اٹھے —— "موہن سنگھ! ڈونٹ مس انڈرسٹینڈ ہر، شی ڈز ناٹ لو یو" تو عرصہ کی منجمد خاموشی کچھ پگھل گئی۔ اس دن میں حوصلہ جوڑ کر کہہ سکی "موہن سنگھ ...... جی! میں آپ کی دوست ہوں۔ آپ کا احترام کرتی ہوں، آپ اور کیا چاہتے ہیں؟" —— میں نے بڑے متامل لفظوں میں صرف اتنا کہا اور میری دانست میں یہ کافی تھا۔ موہن سنگھ جی نے کچھ نہیں کہا، صرف بعد میں ایک چھوٹی سی نظم رقم کی جس میں وہی الفاظ دوہرائے "میں آپ کی دوست ہوں، میں آپ کی دوست ہوں، آپ اور کیا چاہتے ہیں؟" اور اگلی سطریں ایک اداسی کے ساتھ لکھیں "میں اور کیا چاہتا ہوں ......" لیکن کچھ کہانیاں سی ادب میں پھر بھی چلتی رہیں۔ کئی زبانی۔ کئی کچھ لوگوں کی تحریروں میں کنائیۃً، لیکن موہن سنگھ جی کی طرف سے کوئی ایسی تحریر نہیں آئی جو دلآزاری کا باعث ہوتی۔ اس لیے میری جانب سے بھی آج تک ان کے احترام میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک معمولی سا واقعہ اور بھی پیش آیا تھا —— لاہور ریڈیو کے ایک افسر تھے، جن کو شاید ادب کے ساتھ کچھ انس تھا۔ ایک روز میرے ایک براڈکاسٹ کے بعد اچانک کہنے لگے "اگر میں نے آج سے کچھ سال بیشتر تم کو دیکھا ہوتا تو میں مسلمان سے سکھ بن گیا ہوتا یا تم سکھ سے مسلمان بن گئی ہوتیں ......" یہ الفاظ دفعتۃً ہوا میں ابھرے اور اسی تیزی سے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ میرا خیال ہے، یہ ایک لمحی ابال تھا جس کا نہ کوئی پہلا لمحہ اس کے ساتھ جڑتا تھا، نہ کوئی اگلا۔ پھر اس دن کے بعد انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن میں آج تک نہیں جانتی کہ اسی وقت کی فضا میں ان کے کسی بھی احساس کی بات کیسے پھیلی۔ شاید کسی کے سامنے ان کی زبان سے —— اور معلوم نہیں، کن الفاظ میں، کہ بعد میں اس کا بڑا توڑا مروڑا ذکر بھی پڑھا۔ کئی بار لگتا ہے کہ پنجابی ادیبوں کے پاس لکھنے کے لیے کوئی سنجیدہ موضوع نہیں ہے۔ وہ خود ہی افواہیں پھیلاتے ہیں، خود ہی ان کو اپنی مرضی سے جدھر چاہے موڑ دیتے ہیں اور پھر انہیں لکھ لکھ کر ان سے لذت لیتے ہیں ...... ہاں، برسوں بعد جب میں نے دہلی ریڈیو میں ملازمت کی، تو ایک پنڈت سیتہ دیو شرما ہوتے تھے جو لاہور ریڈیو میں بھی سٹاف آرٹسٹ ہوتے تھے اور اب دہلی ریڈیو میں بھی سٹاف آرٹسٹ تھے۔ انہوں نے ہندی میں ایک کہانی لکھی، "ٹوئینٹی سکس مین اینڈ اے گرل"۔ کہانی کا عنوان انہوں نے گورکی کی کہانی سے ہی لیا، لیکن لکھا اس پرانے واقعہ کو۔

اور کہانی لکھ کر مجھے سنائی ۔ بڑے صاف دل انسان تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ لاہور ریڈیو میں، انھیں نہیں معلوم، کہ کتنے لوگ ان میں دلچسپی لیتے تھے۔ خاص کر وہ افسر بھی ۔ اور ہم سارے سٹاف کے لوگ مہینوں ایک فکر سی لگے ساتھ دیکھتے رہے کہ آگے کیا وقوع پذیر ہوگا؟ لیکن کچھ نہیں ہوا ۔ شرما جی یہ کہانی شاید کبھی بھی نہ لکھتے ، لیکن مجھے دیکھ کر انھوں کو برسوں کا پرانا وہ انتظار یاد آگیا جس میں وہ کچھ وقوع پذیر ہونے کے امکان کے بارے سوچتے تھے ۔۔۔۔۔ کہانی میں سٹاف کے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے کانوں کا ذکر تھا، جو کوئی افواہ سننے کی امید میں دیواروں کے ساتھ لگے رہتے تھے ۔ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا تو حیران بیٹھ جاتے تھے کہ شاید کچھ وقوع ہو ہی چکا ہے لیکن کانوں تک نہیں پہنچ رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرما جی عامیانہ سے رائٹر تھے ، لیکن میرا خیال ہے ، یہ کہانی ان کی سب سے عمدہ کہانی تھی ۔ انھوں نے ایک سنتے ہوئے ماحول کو پکڑنے کی سعی کی تھی لیکن اپنی طرف سے ، پنجابی مصنفوں کی مانند ۔ زبردستی کوئی نتیجہ نہیں نکالا تھا ۔ کہانی میں ایک ایماندار سادگی تھی ۔

نفرت کا ایک دائرہ

بات یہ بھی چھوٹی سی ہے لیکن ایک بہت بڑے نفرت کے دائرے میں گھری ہوئی ۔ پنجابی کے ایک شاعر تھے جن کے ساتھ کبھی ملاقات نہیں ہوئی ۔ یہ بھی میری ادبی زندگی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے لاہور کی ۔ اور پتہ چلتا رہتا تھا کہ وہ میرے خلاف بہت بولتے ہیں ۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا ۔ اس لیے حیران ہوتی تھی کہ ان کو میری ذات کے ساتھ کب سے اور کس بات کی پرخاش ہے ؟ پھر ملک کی تقسیم سے تھوڑا عرصہ قبل کی بات ہے کہ ایک بار مجھے کچھ بخار ہو گیا اور ایک اخبار کے مدیر مزاج پرسی کو آئے ۔ ان کے ساتھ ایک کوئی اور تھا جن کو میں نے پیشتر کبھی نہیں تھا دیکھا ۔ انھوں نے نام بتا کر تعارف کرایا تو میں چونک سی گئی ۔۔۔۔۔ یہ وہی تھے جن کو میرے وجود کے ساتھ بھی نفرت معلوم ہوتی تھی ۔ حیران تھی کہ یہ آج میری بیمار پرسی کے لیے کیوں چلے آئے ؛

دو تین روز کے بعد ایک ہفت روزہ اخبار میں شائع ہوئی ان کی نظم پڑھی جس کے نیچے وہی تاریخ درج تھی جس تاریخ کو وہ ملنے آئے تھے ۔ اور یہ نظم عجیب و غریب محبت کی نظم تھی ۔۔۔۔۔ محسوس ہوا ، جیسے نہ نفرت کے لیے کوئی وجہ تھی ، اسی طرح نہ اس ابال کے لیے ۔ اندر جب وہ کچھ بار گھر آئے ، حیرت سے پوچھا کہ یہ اچانک مہربانی کیوں ؟

لیکن کچھ بھی پکڑ میں نہ آیا۔ یہ مانتی ہوں کہ ان کے کسی بول میں کوئی شوخی نہیں تھی، تاہم سختی سی ضرور تھی کہ سب لوگ گھٹیا ہیں، میں کسی سے نہ ملا کروں۔ یہاں تک کہ لاہور ریڈیو کے لیے میں نے جب ادب کی تنقید لکھنا ہوتی تو وہ تقاضا کرتے کہ فلاں ادیب کا نام مت لینا، فلاں کی تعریف مت کرنی، فلاں کی کتاب کا ذکر مت کرنا۔ اس ادبی واقفیت سے دم گھٹنے لگا تو میں پریشان ہو اٹھی۔

لیکن اس تلخی کو ابھی اظہار ملا ہی تھا کہ ملک کی تقسیم ہو گئی اور میں ان کی صحبت سے آزاد ہو گئی۔ پھر کچھ سال بعد سنا کہ ان کے خیال میں ہندوستان کی تقسیم اسی وجہ سے ہوئی کہ میں نے ان کی دوستی قبول نہیں کی تھی۔ اور ان کی دانست میں ہزاروں معصوم عوام کا قتل بھی اسی سبب سے ہوا۔ خیر! ہندوستان کی تقسیم کا اور ہزاروں معصوم لوگوں کے قتل کا یہ میرے اوپر جو الزام تھا، اس کو کوئی ماہر نفسیات ہی جان سکے، میں نہیں جان سکتی۔ اور دیکھنے میں آیا ہے کہ اب، پھر میرے خلاف بولتے تھے اور میرے خلاف نظمیں لکھتے تھے۔ یہ نفرت جیسے ایک گول دائرہ تھا جس کا آخری سرا پھر پہلے سرے کے ساتھ جڑنا ہی تھا۔۔۔۔۔

۱۹۴۷ء

گو قدیم تواریخ کے بڑے ظلم و ستم سے بھرے ابواب ہم لوگوں نے پڑھے ہوئے تھے، پھر بھی ہمارے ملک کی تقسیم کے موقعہ پر جو کچھ ہوا، کسی کے تصور میں بھی اس قسم کا خونی باب نہیں آ سکتا۔ غم و الم کے افسانے کہہ کہہ کر لوگ تھک گئے تھے، لیکن یہ افسانے عمر سے پہلے ختم ہونے والے نہ تھے۔ میں نے لاشیں دیکھی تھیں، لاشوں جیسے لوگ دیکھے تھے۔ اور لاہور سے آ کر ڈیرہ دون پناہ لی، تو ملازمت کی اور دلی میں رہنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش میں دلی آئی تھی۔ اور جب واپسی کا سفر کر رہی تھی تو چلتی گاڑی میں نیند آنکھوں کے نزدیک نہیں پھٹک رہی تھی۔۔۔۔۔ گاڑی کے باہر کی گہری تاریکی وقت کی تاریخ ایسی تھی، ہواؤں میں شائیں شائیں کر رہی تھی جیسے تاریخ کی آغوش میں بیٹھی کراہ رہی ہو۔ باہر اونچے اونچے پیڑ غموں کی طرح اگے ہوئے تھے۔ کئی بار پیڑ نہ ہوتے، صرف ویرانی ہوتی اور اس ویرانی کے ٹیلے یوں لگتے جیسے قبریں بنی ہوں۔۔۔۔۔ وارث شاہ کے بول میرے ذہن میں گھوم رہے تھے: بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے۔۔۔۔ ؟ اور مجھے لگا، وارث شاہ

کتنا عظیم شاعر تھا، وہ ہیر کے غم کو گا سکا۔ آج پنجاب کی ایک بیٹی نہیں، لکھوکھا بیٹیاں رو رہی ہیں۔ آج ان کے غم کو کون گائے گا؟ اور مجھے وارث شاہ کے سوا اور کوئی ایسا نہ دکھائی دیا جس کو مخاطب کر کے میں یہ بات کہتی۔ اس رات چلتی ہوئی گاڑی میں ہلتی اور کانپتی قلم کے ساتھ ایک نظم لکھی۔

آج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول
تے آج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول!
اک روئی سی دھی پنجاب دی، تو لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ درد منداں دیا دردیا! اُٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں، تے لہو دی بھری چناب

لیکن یہی نظم تھی، جب لکھی تھی تو اپنے پنجاب میں کئی اخبارات میرے لیے تہمتوں سے پُر ہو گئے تھے۔ سکھوں کو اعتراض تھا کہ میں نے یہ نظم وارث شاہ کو مخاطب کر کے کیوں لکھی تھی، گورو نانک کو مخاطب کر کے لکھنی چاہیئے تھی۔ اور کمیونسٹ کہتے تھے کہ میں لینن یا سٹالن کو مخاطب کر کے کیوں نہیں لکھی؟ یہاں تک کہ اس نظم کے خلاف کئی نظمیں لکھی گئیں . . .

خالص عورت

بچپن کے بڑھتے ہوئے اعضاء کے ساتھ، پتہ نہیں کون سی گھڑی، ایک تصور بھی جسم کا حصہ بن جاتا ہے اور بڑھنے پھولنے لگتا ہے . . . اور اپنا دل خود ہی سحر بُننے لگ پڑتا ہے . . . . . دنیا کی تعمیر کرنے والی، خدا کی طاقت کا مٹھی بھر جزو شاید ہر انسان کے حصہ میں آتا ہے، معلوم نہیں، لیکن میرے حصہ میں ضرور آیا تھا . . . اور اس میں سے میں نے ایک مرد کا سایہ گھڑا تھا . . . . اور اس سائے کو اپنے جسم سے چپکا کر ـــــ عمر کے سال گذارنے لگ گئی تھی۔

ہو سکتا ہے، یہ جس کو میں نے طاقت کہا ہے، یہ اپنی طبعی صورت میں طاقت نہیں۔ یہ کچھ اس قسم کی قوت ہے، جو انتہائی خطرے کے وقت، ایک اس معمولی سے انسان کے اندر بھی آجاتی ہے جو ساری مٹانے والی قوتوں کو سامنے دیکھ کر اپنا آخری حیلہ بھی اپنے

اعضا میں جگا لیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عورت تھی، چاہے بچی سی، اور یہ خوف ورثے میں پایا تھا کہ دنیا کے بھیانک جنگل سے میں اکیلی نہیں گذر سکتی ۔ اور شائد اسی خوف میں سے اپنے ساتھ کے لیے ایک مرد کے چہرے کا تصور کرنا، میرے تخیل کا آخری حیلہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس مرد لفظ کے میرے معنی کہیں بھی پڑھے سنے یا پہچانے ہوئے معنی نہیں تھے ۔ تحت الشعور میں جانتی ضرور تھی، تاہم اپنے آپ کو بھی بتا سکنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ صرف ایک اعتماد سا تھا ـــ کہ دیکھوں تو پہچان لوں گی ۔

لیکن دور، میلوں تک بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ۔ اور یوں سالوں کے قریب اٹھتیس میل نکل گئے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے جب اس کو اوّل مرتبہ دیکھا ـــ تو مجھ سے بھی پہلے میرے دل نے اس کو پہچان لیا ۔ اس وقت میری عمر اٹھتیس برس کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تصور اتنے سال زندہ رہا، اور اس کے معنی بھی زندہ رہے، اس پر حیران ہو سکتی ہوں، لیکن حیران نہیں۔ کیونکہ جان لیا ہے کہ یہ میرے "میں" کی توضیح تھی ۔ تھی بھی اور ہے بھی! میں ان سالوں میں نہیں مٹی ۔ اس لیے وہ بھی نہیں مٹی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نہیں کہ تصور کے ساتھ شکوہ نہیں آیا؛ اس عمر کی کئی نظمیں خالصتاً شکوہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے "لکھ تیرے انبلاں وچوں، دس کی لبھا سالوں! اکو تند پیار دی لبھی، اوہ وی تند اکہری ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن یہ اکہری تند (سوت کی تار) سالوں کے ساتھ ٹوٹی نہیں، اسی طرح میری جان کو اپنے اندر لپیٹ کر میری عمر کے ساتھ چلتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔

ان سالوں کے راستہ میں دو بڑے حادثے ہوئے ۔ ایک، جن کو میرے دکھ سکھ کے ساتھ ازل سے واسطہ تھا، میرے والدین، ان کے ہاتھوں ہوا ۔ اور دوسرا اپنے ہاتھوں ۔ یہ ایک، میری چار سال کی عمر میں میری سگائی کی صورت میں، اور میری سولہ سترہ سال کی عمر میں شادی کی صورت میں تھا ۔ اور دوسرا، جو میرے اپنے ہاتھوں ہوا، یہ میری بیس اکیس کے سن میں ایک محبت کی صورت میں تھا ۔

لیکن تصور جو میرے اعضاء کی طرح میرے بدن کا جزو تھا ـــ میرے بدن میں بے لاگ ہو کر بیٹھا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو کئی سال سماج نے بھی سمجھایا، اور کئی سال میں نے خود بھی، لیکن اس نے پلکیں نہیں جھپکیں۔ وہ سالوں کے پار ـــ اس ویرانگی کی طرف دیکھتا رہا ۔ جہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا ۔ ۔ ۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں، اس وقت

یہ ی عمر کو چھتیسواں سال لگا ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس وقت ــــ میں نے جانا
ــــ کہ یوں اس کو، اس سے کچھ علیحدہ یا آدھا یا نصف بٹا ساڑھے، کچھ نہیں ہونا چاہیئے!
یوں میرے وجود کے اندر کی عورت ہمیشہ میرے اندر کے ادیب سے ثانوی درجہ
رہی ہے کئی بار یہاں تک کہ میں اپنے بیچ کی عورت کی اپنے آپ کو یاد کراتی رہی ہوں۔
بت ادیب کا روپ ہمیشہ اس قدر تاباں رہتا ہے کہ میری اپنی آنکھوں کو بھی اپنی پہچان
اسی سے ملتی ہے۔ تاہم زندگی میں تین مواقع ایسے آئے تھے ــــ میں نے اپنے
بیچ کی خالص عورت کو جی بھر کر دیکھا تھا۔ اس کا روپ اتنا بھرا پورا تھا کہ میرے اندر کے
ادیب کا وجود میری یاد سے محو ہو گیا تھا۔ وہاں، اس وقت کوئی تھوڑی سی بھی خالی جگہ
نہ تھی جو اس کی یاد دلاتی۔ یہ یاد صرف اب تازہ کر سکتی ہوں ــــ سالوں کے فاصلہ
پر کھڑے ہو کر۔

پہلا وقت ــــ اس گھڑی دیکھا تھا، جب میری عمر پچیس سال کی تھی۔ میرا
کوئی بچہ نہیں تھا اور مجھے اکثر رات کو ایک بچے کا خواب آتا تھا۔ ایک ننھا سا چہرہ،
بڑے تراشے ہوئے نقوش۔ سیدھا ٹکٹکی میری طرف دیکھ رہا، اور کئی بار کے
خواب سے مجھے اس کے چہرے کی پختہ پہچان ہو گئی تھی۔ خواب میں میں پودوں کو پانی دے رہی
ہوتی تھی ــــ اور اچانک ایک گملے میں سے پھول اُگنے کے بجائے ایک بچے کا چہرہ اُگ
پڑتا تھا ــــ میں حیرت زدہ، چونک کے پوچھتی تھی ــــ "تم کہاں تھے؟ میں تم کو
ڈھونڈتی رہی۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ چہرہ ہنس پڑتا تھا ــــ "میں یہاں تھا، چھپا ہوا تھا" اور میں جلدی
سے گملے سے بچے کو اٹھا لیتی تھی۔ جب جاگتی تھی، میں ویسی کی ویسی ویران ہوتی تھی۔ اکیلی۔
ایک خالص عورت۔ جو اگر ماں نہیں تھی بن سکتی، تو زندہ رہنا نہیں تھی چاہتی۔
دوسری بار ــــ اس قسم کا موقعہ اس وقت دیکھا تھا، جب ایک دن ساحر آیا تو
اس کو ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں درد تھا ــــ سانس کھنچا کھنچا تھا۔
اس روز اس کے گلے اور چھاتی پر وکس ملی تھی۔ کتنی دیر ملتی رہی تھی ــــ اور لگا تھا ــــ
یوں پاؤں کے بل کھڑی، میں پوروں سے، انگلیوں سے، اور ہتھیلی کے ساتھ، اس کی
چھاتی کو چھوتے ہوئے ملتی ہوئی ساری عمر بتا سکتی ہوں۔ میرے بیچ کی خالص عورت کو اس
پل دنیا کے کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔

اور تیسری بار ـــــــ یہ خالص عورت، میں نے اس وقت دیکھی تھی ـــــــ جب اپنے سٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے امروز نے ـــــــ اپنا پتلا سا برش اپنے کاغذ سے اٹھا کر، ایک بار سرخ رنگ میں ڈبویا تھا، اور پھر اٹھ کر اس نے اس برش کے ساتھ میری پیشانی پر ایک بندیا لگا دی تھی۔

اس میرے اندر کی خالص عورت کی خالص ادیب کے ساتھ کوئی پرخاش نہیں۔ اس نے خود ہی اس سے پیچھے، اس کے تعقب میں کھڑے رہنا قبول کر لیا ہوا ہے۔ اپنے بدن کو اس کی نگاہوں سے چراتے ہوئے۔ اور شائد اپنی آنکھوں سے بھی۔ اور جب تین موقعوں پر اس نے اگلی جگہ پر آنا چاہا تھا، تو میرے اندر کی خالص ادیبہ نے پیچھے ہٹ کر اس کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔

خالص ادیب کا روپ میرے ساتھ رہتا ہے ـــــــ افکار میں بھی، خوابوں میں اور یوں اس کی اور میری شبیہہ ایک ہی بن گئی ہوئی ہے۔ لیکن خالص عورت کا روپ میں نے صرف تین بار دیکھا تھا، حقیقت ہے، لیکن آنکھوں سے صرف تین بار دیکھا تھا۔ اس لیے کئی بار متعجب سی ہو جاتی ہوں ـــــــ وہ کس قسم کا تھا؟ میں نے سچ مچ دیکھا تھا؟

ایک قرض

اٹھارہ سو ستاون کے غدر کا مجھے کچھ علم نہیں، لیکن یہ غدر، لفظ دادی اماں سے سنی ہوئی کسی کہانی کی طرح، میرے اندر اٹکا ہوا تھا . . . . . یہ لفظ کسی جیتی جاگتی شئے جیسا بھی تھا اور مری ہوئی شئے ایسا بھی . . . . کبھی کئی طرح کی آوازیں اس میں سے سنائی دیتی تھیں ـــــــ معلوم نہیں، کس کی، تاہم انسانی آوازیں ـــــــ ایک دوسری سے کھوئی ہوئیں، ایک دوسری کو ڈھونڈتی ہوئیں، تلواروں کی طرح جھنکارتیں بھی، زخموں کی مانند رستی ہوئیں بھی . . . . کئی رنگ بھی اس لفظ میں سے لہو کی طرح بہتے تھے . . . . . . لیکن پھر یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ کبھی کا مر چکا ہے، صرف میرے خیال کبھی اس پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ جاتے ہیں . . . .

اس غدر کی صرف ایک نشانی میں نے آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جس گھرانے میں شادی ہوئی، میں چار سال کی تھی جب میری منگنی ہوئی تھی، سولہ سال کی تھی جب شادی ہوئی)، یہ نشانی اس گھرانے میں پچھلی نسل سے چلی آ رہی تھی۔ یہ ایک قالین تھا جو دلی کی لوٹ کے

موقعہ پر اس خاندان کے ایک سردار نے لوٹا تھا۔ کسی زمانے میں اس میں معلوم نہیں، کس قسم کے رنگ تھے۔ لیکن جب میں نے دیکھا ——— یہ صرف رنگوں کا اور ریشم کا گھسا سا تھا۔ گھر کا دادا ہمیشہ اس قالین پر سوتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ خاندان لاہور میں ہوتا تھا۔ پھر انیس سو سینتالیس میں جب ہندو مسلم آبادی کا تبادلہ ہوا، یہ خاندان دہلی آگیا۔ بھرے گھر کو چھوڑ کر جب سبھی لوگ آئے، گھر کے بزرگ دادا نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا، یہ افراتفری تھوڑے دنوں کی ہے۔ سرکاریں لوگوں کے گھر نہیں چھین سکتیں۔ وہ وہیں رہے گا اور بھرے گھر کی حفاظت کرے گا۔ لیکن جب حالات زیادہ بگڑ گئے تو لڑکی نے اس کو ٹرک میں بٹھا کر دہلی بھیج دیا ——— بستر کے نام سے وہی قالین تھا جو وہ اپنے ساتھ لا سکا، اور کچھ نہیں۔ بھرے گھر کو چھوڑنے کا غم اور راستے کی تکالیف اس سے زیادہ عرصہ برداشت نہیں ہوئیں۔ دہلی پہنچ کر وہ بہت تھوڑے دن زندہ رہا۔ وہی قالین اس کے نیچے بچھا ہوا تھا جب اس کی موت ہوئی۔ اس کے بعد وہ قالین کسی غریب غربا کو دے دیا گیا۔ ایک ذکر تھا جو اس وقت سب کی زبان پر تھا ——— "دہلی کے غدر کے موقعہ پر ہم نے یہ قالین دہلی میں لوٹا تھا، آج دہلی کی لوٹ ایک صدی کے بعد دہلی کو واپس موڑ دی ..."

لوٹ بھی شاید ایک قرض ہوتا ہے جو کبھی نہ کبھی موڑنا ہوتا ہے .... کبھی ایک خوفناک سا خیال آتا ——— کہ میں نے بھی کسی کا کچھ واپس دینا ہے ——— معلوم نہیں کیا، معلوم نہیں کس کو ..... اور معلوم نہیں کب ... کبھی کنگھی کرتے ہوئے کنگھی بالوں میں اٹک جاتی تھی ——— خیال بالوں کی الجھنوں کی طرح الجھ جاتے تھے ——— میری ماں کی ماں نے، اور اس کی ماں کی ماں نے، ہر عورت کی ماں نے، معلوم نہیں، کون سے غدر کے وقت سماج سے یہ سولہ شنگار لوٹے تھے، اور وہ یہ شنگار نسل در نسل چلے آ رہے ہیں .... لیکن سماج کا یہ قرض اتارنا ہے، معلوم نہیں کب، معلوم نہیں کس طرح ... میں نے بھی اور دوسری بھی کتنی عورتوں نے ..... اور کسی کا تو معلوم نہیں۔ لیکن جانتی تھی، میں بہت ہی مقروض ہوں ....

ہندوستان کی تقسیم سے قبل بھی کئی بار احساس ہوتا تھا۔ ایک بار اسی مبحث میں سے نظم لکھی تھی "اے ہمسفر! آج سایہ تیرا دور جا رہا ہے ..." لیکن اس دوری کا تعلق کسی

بیرونی واقعہ سے نہیں تھا جڑا ہوا۔ یہ فاصلہ صرف اندر کا تھا۔۔۔ یہی اندرونی فاصلہ ۔۔۔ زمین کی سطح پھاڑ کر باہر نکل آیا۔ یہ سطح کو پھاڑنے کا وقت جسم کی ہڈیوں کو توڑ دینے والا وقت تھا۔ بیٹے کا ایمان کہتا تھا میں اپنے شوہر کر اس کا حق ادا نہیں کر رہی۔ اس کی عبادتوں میں سے مندر کے مال کی طرح چرائی ہوئی ہے۔ یہ واپس کرنی ہے۔۔۔۔ واپس کرنی ہے۔۔۔۔ اس کے لیے دونوں حالتیں تکلیف دہ تھیں ——— جو فاصلہ خیالوں کی رگ رگ میں تھا، وہ بھی تکلیف دہ تھا۔ اور جو سماجی شکل میں پڑتا تھا۔ وہ بھی دونوں میں سے ایک کا انتخاب سامنے تھا ——— تو یہ پہلی حالت کے مقابلے دوسری کے ساتھ ضرور زیادہ ایمان جڑا ہوا تھا۔ اس لیے دوسری حالت منتخب کی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ یہ ایک سنجیدہ دوستانہ فیصلہ تھا۔ جس میں کسی کی بھی زبان پر کسی کی بھی شخصیت کی سبکی کرنے والا لفظ آنے کا سوال نہیں تھا۔ جو ایک دوسرے سے پایا تھا۔ اس سے انکار نہیں تھا۔ جو نہیں پایا تھا، اس کے ساتھ کوئی گلہ نہیں تھا۔ صرف جو کچھ ان پایا تھا۔ یہ دوری اسی کا تقاضا تھی، اسی کی ضرورت تھی ——— میرا خیال ہے، دونوں کے لیے ایک سی ضروری۔ اس لیے اپنے اپنے حصے

کا درد بانٹ لیا۔ موہنہ اتنے سرخرو تھے، سمجھتے تھے کہ اس درد سے موہنوں کو چھپانے کی حاجت نہ تھی۔ یہ درد بھی آنکھوں اور لبوں کی طرح چہرے کا حصہ تھا۔ یا کسی تل کی طرح، سیاہ داغ کی طرح۔ اس کو قبول کرنا تھا، کیا۔ اپنے اعضا کی مانند اور اس کو اپنی ہستی کا ایک حصہ مان کر۔ قانون کو اجنبی جان کر کچھ نہیں کہا۔ نہ اس سے کچھ پوچھا نہ اس کو کچھ بتایا۔ جب ساتھ چنا تھا، اس وقت بہت انجان تھے، اس لیے قانون کا سہارا لیا تھا۔ لیکن جب ساتھ توڑا ہے اس وقت دونوں کے اندر کی سچائی دونوں کے لیے قانون سے کہیں زیادہ طاقتور ہو چکی تھی۔۔۔۔

جانتی ہوں ——— اس سے اگلے سالوں نے جو انصاف مجھ سے کیا ہے۔ وہ مجھ سے جدا ہوئے میرے ہم سفر کے ساتھ نہیں کیا۔ مجھ کو اس سے اگلے برسوں میں امروز کی حسین رفاقت حاصل ہو گئی۔ لیکن اس کو صرف تنہائی ملی۔ اس کو کچھ بھی دیتے وقت زندگی کے ہاتھ کنجوس ہو گئے۔ ہم اب بھی دوستوں کی طرح ملتے ہیں، لیکن جانتی ہوں، اتنی سی بات کسی ویرانی کو پُر نہیں کر سکتی، تنہائی کی عنت جس کسی

اپنے انسان نے جھیل سے اس کے آگے سجدے میں سر جھک جاتا ہے۔ لیکن جھکے سر میں بھی ایک تفخر ہے، سر سے بھی اونچا، کہ جس حفاظت کی قیمت میں نے نہیں چکائی تھی، اور جو سماجی درجہ اور گھر گھرانے کی آبرو میں نے زندگی کے غدر میں یونہی راہ چلتے حاصل کر لی تھی، وہ واپس موڑ سکی ہوں، ایک قرض تھا جو اتار سکی ہوں۔

جو اکثر ہوتا ہے، وہ میرے ساتھ نہیں ہوا۔ اکثر کہانی کے وہ کردار عداوت یا مخالفت کے داغ کہانی کو لگاتے ہیں جن کا کہانی کے ساتھ نزدیکی رشتہ ہوتا ہے۔ اور دور دراز کے لوگوں میں سے زیادہ تر بے واسطہ رہتے ہیں۔ لیکن کچھ ہوتے ہیں، جو تھوڑا درد بنا لیتے ہیں۔ لیکن میری کہانی کے ساتھ جنہوں نے برسہا برس مخاصمت پالی، وہ کہانی کے دور تک کچھ نہیں لگتے تھے۔ وہ کچھ میرے ہم عصر تھے کچھ وہ راہ چلتے دکھانے والے جن کو میرے دل کی تو کیا، چہرے کی بھی پہچان نہ تھی۔ اور کچھ پنجابی اخبارات (میرے ایک ہم عصر نے مجھ سے الگ ہوتے میرے خاوند پر یہاں تک زور دیا کہ اگر وہ ایک بار کاغذ پر دستخط کر دیں تو وہ مجھ کو سالہا سال عدالتوں میں خراب کرتا رہے گا)، لیکن جو اس کہانی کے دھاگوں میں بُنے ہوئے تھے، وہ ہمیشہ چپ چاپ، اپنے اپنے حصے کی ٹیسیں اور کھرونچیں سہتے رہے۔ کئی کئی سال بعد بھی ملاقات ہوتی تو آنکھیں ادب سے معمور ہو جاتیں۔ ان آنکھوں کے بارہ میں آج بھی اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں ——— انہوں نے یا آنسو دیکھے ہیں یا ادب۔ ان کو اور کسی تیسری شے سے کبھی واسطہ نہیں تھا۔

میرے اور میرے سے جدا ہونے ساتھی کے رشتہ کی، میں نے دیکھا ——— کہ ایک دیویندر نے گہرائی کو کچھ سمجھا تھا۔ اس نے جب "قلم دا ہمیت" کتاب لکھی، چھپ کے آئی، تو میں اس کتاب کی ڈیڈی کیشن دیکھ کر حیران ہوئی تھی ——— کسی دل کے اور گھر کے اس دروازے کے نام جو امرتا کے لیے کبھی بند نہیں ہوا ——— اور وہ بڑے ادب واحترام کے ساتھ یہ کتاب میرے اس ساتھی کو دینے گیا تھا، جس سے میں علیحدہ ہو چکی تھی۔ علیحدگی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سلام و دعا تک نہ پہنچے۔ بچوں کی کسی ضرورت کے وقت یا میرے انکم ٹیکس کے کسی جھمیلے پر، یا یوں ہی کچھ دنوں کے بعد، میں بھی فون کر لیتی ہوں، وہ بھی۔ اس سادگی اور طبعی پن کو باہر کے

لوگوں میں سے اگر کوئی سمجھ سکا تو وہ آسٹریلیا کی ایک ادیبہ بیٹی کولنز ہے جو اپنے خاوند سے طلاق لے کر بھی ہر مشکل کے وقت اسی سے دوستوں کی طرح صلاح لیتی ہے اور اس کے مطلوقہ خاوند کی دوسری بیوی جب بھی اپنے شوہر کی متلون مزاجی سے کبھی پریشان ہوتی ہے تو وہ بیٹی کو فون کر کے اس سے ملتی ہے، دونوں مل کر کافی پیتی جاتی ہیں اور وہ بیٹی سے مشورہ لیتی ہے کہ اس کی متلون مزاجی کے ساتھ کس طور نپٹے۔ یہ سادگیاں بھی، خود جینے کے بغیر شائد فہم کی پکڑ میں نہیں آتیں . . . . .

۱۹۵۹ء کی ایک قید — ایک خوفناک لمحہ

والد جب حیات تھے، سنایا کرتے تھے کہ زندگی کی پہلی ہولناک حیرت ان کو اس وقت ہوئی تھی جب ایک بار غیر ملک کو جاتے وقت انہوں نے باپ کی جائیداد میں سے ملا زیوروں اور اشرفیوں سے بھرا ایک لوہے کا ٹرنک، اپنے شہر گوجرانوالہ کی ایک قابلِ احترام بھگتی کہلانے والی عورت کے پاس امانت رکھا تھا اور جس نے بعد میں صرف اتنا کہا تھا —— کیسا ٹرنک؟ اور ۱۹۵۹ء میں میں نے اپنے والد کے منہ کا تصور کر کے جیسے کہہ رہی تھی —— آپ کے گوجرانوالہ کی ایک بھگتنی ہوتی تھی نا۔ اس کی گدی پر بیٹھنے والی ایک بھگتنی میں نے بھی دیکھی ہے۔ میں نے اس کے پاس اعتماد کا بھرا ہوا ایک صندوق امانت رکھا تھا، اور اب وہ کہہ رہی —— کیسا اعتماد؟"

ایک بڑا بھیانک پل تھا۔ اندھیرا بادلوں کی طرح گھِرتا آ رہا تھا۔ اور اسی ذرہ ذرہ میں رچی تھی، لیکن بادل گھٹتے نہیں تھے۔ اس پیارے سے چہرے والی لڑکی کو کئی سال پیار کیا تھا۔ بیتے ہوئے دن بادلوں کی ہر چند دری کی طرح آنکھوں کے آگے کئی کئی شکلیں اختیار کرنے لگے۔ سوچنے لگی، بادلوں کی ہر چند دری اس قسم کی یادوں کے لیے تو نہیں تھی بنی . . . . جسم میں سے جیسے کوئی سوئیاں چگتا ہے، ایک ایک یاد کو لے کر ایک کہانی لکھی —— کالے اکھر، کرماں والی، ہتھ ٹوکا، کیلے دا چھلکا اور ایک ننھی اینتا ناول میں شانتی بی بی کا کردار، لیکن اس شانتی بی بی نے میری زندگی میں جو جو کچھ کیا تھا، وہ ذخیرہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں پھر ایک طویل افسانہ لکھا "دو عورتاں" (نمبر پنج) اور اس کی کہانی "مس دی" میں، محسوس ہوا، وہ بہت حد تک سما

ں ستے ۔

دلچسپ سی بات تھی جب واقفیت ہوئی تھی (اس کی واقفیت کی پوری تفصیل "درخورتاں مہر تیغ کہانی" میں ہے) اس کی شادی کے موقعہ پر میرے پاس —— پاکستان سے بچے کھچے دو تین زیور تھے وہ دے دیئے تھے ۔ ان کا غم نہیں تھا۔ صرف یہ تھا —— کہ اندھیرا جب پھنسا تھا تو وہ زیور بہت زور سے ہنستے تھے .... پھر وقت پار غور سے دیکھا تو لگا —— زیور نہیں ۔ ٹوٹے ہوئے اعتماد کے ٹکڑے تھے جو اندھیرے میں چمکتے تھے اور ہنستے تھے .... اس کے معصوم سے لگنے ہونٹوں کو ۔ میں نے ریشمی دھاگوں کی طرح گلے لگایا تھا ۔ رشوجی نے سانپوں کو گلے لگایا تھا لیکن ریشمی دھاگے سمجھ کر نہیں ۔ سوچا کرتی تھی —— میں شوجی نہیں، پھر شوجی نے اپنی تقدیر مجھ کو کیوں دی؟

میں ہلکی سے ہلکی مہک بھی سونگھ سکتی تھی ، لیکن جھوٹ کی تیز سے تیز مہک سونگھنے کی بھی طاقت مجھ میں نہیں تھی ۔ یہ طاقت میرے باپ میں بھی نہیں تھی —— جو بچپن میں آنکھوں سے دیکھا تھا . . . . انہوں نے سیالکوٹ کے ایک آدمی کو پڑھایا لکھایا،

پھر اپنے پاس ملازمت دی ۔ لیکن ایک بار اس نے والد کے خط کی اوپر کی عبارت پھاڑ کر دستخطوں سے اوپر خالی حصے میں ایک نئی عبارت لکھ لی کہ انہوں نے اتنے ہزار روپے (پوری رقم اب مجھے یاد نہیں) اس سے قرض لیے تھے ، اور عدالت میں دعوے دائر کر دیا ۔ میں اس آدمی کو ماماجی کہہ کر پکارتی تھی ۔ بڑی چھوٹی تھی ، لیکن اس وقت اپنے والد کے چہرے پر جو اذیت ناک حیرت دیکھی تھی ، وہی پھر ۱۹۵۹ء میں میں نے اپنے چہرے پر دیکھی ۔ حیران تھی —— حادثوں کے خلیے کس طرح مل جاتے ہیں ۔ میں نے اس لڑکی کو پڑھائی کے پیسے کتابیں دی تھیں ، فیس دی تھیں ، بالکل اسی طرح جیسے میرے والد نے ایک رشتہ دار بچے کو پاس رکھ کر پڑھایا تھا ، جب آخر عمر میں جب وہ ضلع ہزاری باغ چلے گئے تھے ، کچھ ایکڑ زمین سے ان کو ایک باغیچہ بنانے کا ابال آیا تھا ۔ اس لڑکے کو ساتھ لے گئے تھے ۔ سارا کچھ اس زمین کے نقشوں کی لکیروں میں رہ گیا اور میعادی بخار میں ان کی زندگی ختم ہو گئی ۔ ان کی خریدی زمین کے بارہ میں کچھ دیر خط آتے رہے ، بعد میں خاموشی چھا گئی ۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی —— لیکن معلوم ہوا کہ اسی لڑکے نے غیر

قانونی طور سے وہ زمین فروخت کردی [illegible] کی رقم جیب میں ڈال کر خوشی خوشی [illegible] کرلی تھی۔ اس کے بارہ میں اس کے بارہ میں صرف ایک ہی جملہ بچا رہ گیا تھا۔ —
"یہ سوچ بھی نہیں تھی سکتی ....، یہ سوچ بھی نہیں تھی سکتی ...."
یہ ۱۹۵۹ء کا وہی پل ہے، جب میں نے اس لڑکی کو آخری بار دیکھا تھا۔ اور آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹتے دیکھا تھا جو اعتماد کا ستارہ تھا۔

۱۹۶۰ء

یہ سال میری زندگی کا سب سے اداس سال تھا۔ زندگی کے کیلنڈر میں پھٹے ہوئے ورق کی طرح۔ دل نے گھر کی دہلیزوں سے باہر قدم رکھ لیا تھا، لیکن سامنے کوئی راستہ نہ تھا، اس لیے ٹھہرا کر کانپنے لگا۔ ساحر کو بمبئی فون کرنے کے لیے فون کے پاس گئی تھی کہ عجیب اتفاق ہوا تھا۔ اس روز کے بلٹز میں تصویر بھی تھی اور خبر بھی کہ ساحر کو زندگی کی اک نئی محبت مل گئی ہے۔ بات فون کے ڈائل سے کچھ انچ پرے، خلا میں کھڑے رہ گئے......

ان دنوں میں نے اپنے دل کی حالت کو آسکر وائیلڈ کے لفظوں میں چھپاتا تھا میں نے مرجانا سوچا.... اسنے قبر کی سوچ ذرا سی مدھم پڑ گئی، میں نے جینے کے لیے اپنا من بنالیا۔ لیکن سوچا، اداسی کو میں ایک شاہی لباس بنالوں گا، اور ہر وقت پہن کر رکھوں گا..... جن دہلیزوں میں قدم رکھوں گا، وہ گھر بیراگ کا مرکز بن جائے گا.... میرے دوستوں کے قدم میری اداسی کو ماپ ماپ کر چلا کریں گے.... لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ یہ سب کچھ تکلیف دہ میں بھول جاؤں۔ مجھے معلوم ہے، یوں کرنا بڑا ہلکا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند سورج کی خوبصورتی، سویرے کی پہلی کرنوں کی موسیقی، گہری راتوں کی خاموشی، پتوں میں سے چھن چھن کر گرتی بارش کی بوندیں، گھاس پر پھسلتی شبنم، یہ سب کچھ میرے لیے تلخ بن جائے گا..... اپنے تجربے سے منکر ہونا یوں ہے جیسے اپنی زندگی کے ہونٹوں میں کوئی ہمیشہ کے لیے جھوٹ بھر دے..... یہ اپنی روح سے منکر ہونا ہے..

امروز کے ساتھ دوستی تھی لیکن تامل اور جھجک میں سے گذرتی ہوئی۔ زندگی کی سب سے اداس نظمیں میں نے اس سال لکھیں۔ ان دنوں کا ایک عجیب خواب

مجھے من وعن یاد ہے ۔

گاڑی میں سفر کر رہی تھی ۔ سامنی سیٹ پر ایک بزرگ چہرہ تھا، بڑا نرم اور تاباں۔ لمبے سفر میں کتابوں کے اوراق پلٹتی رہی، پھر بہری خاموش کتابوں نے اس بزرگ کو بازو میں لگا لیا ۔ اس نے مجھ سے پوچھا "تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" کہا "کالا گلاب؟ ——— نہیں تو!" وہ کہنے لگا یہاں اور تھوڑی دیر میں ایک سٹیشن آئے گا، وہاں سے ایک راستہ ایک چھوٹے سے گاؤں کو جاتا ہے ۔ اس گاؤں میں گلاب کے پھولوں کا ایک باغ ہے ۔ اس باغ میں تھوڑے سے سرخ رنگ کے گلاب ہیں باقی سارا باغ کالے گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے ——— "

"سچ؟"

"تم وہ باغ دیکھنا چاہو گی؟"

"میں یہی سوچ رہی ہوں ——— اگر میں اس باغ کو دیکھ سکوں . . . "

"اس کی ایک کہانی بھی ہے ——— "

"کیا؟"

"اگر تم وہ دیکھنے چلو، میں وہیں یہ کہانی سناؤں گا"

"میں چلوں گی!" اور پھر ایک سٹیشن پر میں اور وہ بزرگ اتر گئے ۔ ایک لمبا کچا راستہ پکڑا، وہاں کوئی سواری نہیں جاتی تھی ——— اور پھر سچ مچ ہم ایک باغ میں پہنچ گئے ——— اتنا بڑا اور تاباں گلاب میں نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا ۔ گلاب کی پتیوں پر سے نگاہ پھسل پھسل جاتی تھی ۔ بہت بڑا باغ تھا ۔ ایک چھوٹے سے حصے میں لال سرخ گلاب تھے، اور ایک چھوٹے سے حصے میں سپید دودھیا رنگ کے باقی سارا، میلوں تک پھیلا ہوا باغ کالے سیاہ گلاب سے بھرا ہوا تھا۔

"اس کی کہانی؟"

"کہتے ہیں، ایک عورت ہوتی تھی، بڑے سچے دل کے ساتھ اس نے کسی سے محبت کی ۔ ایک بار اس کے محبوب نے اس کے بالوں میں سرخ گلاب کا پھول لگایا اور عورت نے محبت کے بڑے پیارے گیت لکھے، وہ محبت پروان نہ چڑھی۔ اس عورت نے اپنی زندگی سماج کی غلط قدروں پر قربان کر دی ۔ ایک ناقابلِ برداشت

درد اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ اور وہ ساری عمر اپنی قلم کو اس درد سے بھگو کر گیت لکھتی رہی۔ خود کا سوز ۔۔ وہ نظر بخشتا ہے، جس نظر سے کوئی پرائے درد دل کو دیکھ سکتا ہے۔ اس نے اپنے درد میں ساری انسانیت کے درد کو ملا لیا اور پھر وہ گیت لکھے ۔۔ جن میں صرف اس کا نہیں، تمام لوگوں کا درد تھا۔"

"پھر؟"

"جب وہ عورت مر گئی، اس کو اس زمین میں دفنایا گیا ۔۔۔ اس کی قبر پر معلوم نہیں، کس طرح گلاب کے تین پھول اُگ آئے۔ ایک پھول لال رنگ کا تھا، ایک کالے رنگ کا، اور ایک سفید رنگ کا!"

"عجیب بات ہے!"

اور پھر وہ پھول خود ہی بڑھتے گئے۔ نہ کسی نے آبیاری کی، نہ کسی نے دیکھ بھال کی۔ اور آہستہ آہستہ یہاں ایک پھولوں کا باغ بن گیا۔ اب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، ایک حصے میں سرخ رنگ کے گلاب ہیں، ایک حصے میں سپید رنگ کے، اور باقی سارے حصے میں سیاہ رنگ کے!"

"لوگ کیا کہتے ہیں؟"

لوگ کہتے ہیں، اس عورت نے جو محبت کے گیت لکھے، وہ سرخ رنگ کے گلاب بن گئے ہیں، ۔۔۔ اور جو سوز و گداز کے گیت لکھے، وہ گلاب سیاہ رنگ کے ہو گئے ہیں ۔۔۔ اور جو اس نے انسانی پیار کے گیت لکھے، وہ سپید گلاب کے پھول بن گئے ہیں۔"

سر سے پاؤں تک مجھے ایک کپکپی آئی، اور میں نے اس بزرگ سے دریافت کیا:۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام!...... میرا نام 'وقت'"

"اے وقت! تم میری کہانی ہی مجھ کو سنا رہے ہو؟" اور وقت کی مسکراہٹ کے ساتھ اور میری اپنی کپکپی کے ساتھ میری نیند کھل گئی۔

اور اس وقت ہی لکھا ۔۔۔ المیہ یہ نہیں ہوتا کہ رات کی کٹوری کو کوئی زندگی

کے شہد سے نہ بھر سکے اور اصلیت مجھے جھوٹ کبھی اس شہد کو نہ چکھ سکیں ——

المیہ یہ ہوتا ہے جب رات کی کٹوری پر سے چاند کی تتلی اتر جائے اور اس کٹوری میں پڑا ہوا نعتور کسمسا جائے۔

المیہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ کی تقدیر سے آپ کے محبوب کا سرنامہ نہ پڑھا جائے اور آپ کی عمر کی چٹھی ہمیشہ بھٹکتی رہے۔ المیہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے محبوب کی طرف اپنی عمر کا سارا خط لکھ لیں اور پھر آپ سے آپ کے محبوب کا سرنامہ کھو جائے۔

المیہ یہ نہیں ہوتا کہ زندگی کے طویل سفر پر سماج کے بندھن اپنے کانٹے بکھیرتے رہیں اور آپ کے پاؤں میں سے ساری عمر خون بہتا رہے۔ المیہ یہ ہوتا ہے کہ آپ لہولہان پاؤں کے ساتھ ایک اس مقام پر کھڑے ہو جائیں جن کے آگے کوئی راستہ آپ کو بلاوا نہ دے۔

المیہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنے عشق کے ٹھٹھرتے بدن کے لیے ساری عمر گیتوں کے پیراہن سیتے رہیں۔ المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان پراہنوں کو سینے کے لیے آپ کے پاس خیالوں کا دھاگا ختم ہو جائے اور اور آپ کی قلمی سوئی کی نوک ٹوٹ جائے۔

اس سال کے آخر میں میں ایک سائیکی ایٹرسٹ کے زیر علاج بھی رہی، اپنے آپ کو جاننے کے لیے، اور اس کی ہدایت پر روز کے خیالات و افکار اور سپنے کاغذ پر لکھا کرتی تھی۔ ان دنوں کے عجیب و غریب خواب جو ڈاکٹر کے پڑھنے کے لیے لکھے تھے، یہ تھے:

کسی بڑی اونچی عمارت کی چوٹی پر میں اکیلی کھڑی ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑی قلم کے ساتھ باتیں کر رہی تھی "تم میرا ساتھ دو گی ؟ کتنا عرصہ میری رفاقت کرو گی ؟" اچانک کسی نے گھسٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا —— "تم جلاد ہو۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو" میں نے کہا اور زور سے اپنا ہاتھ چھڑا کر عمارت کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ میں بڑی تیز اتر رہی تھی لیکن سیڑھیاں ختم ہونے میں نہ آئی تھیں۔ میرا سانس تیز ہوتا جاتا تھا کہ ابھی پیچھے سے آ کر وہ جلاد مجھے پکڑ لے گا۔ آخر سیڑھیاں ختم ہو گئیں، لیکن نیچے

اٹھ کر دیکھا کہ سب طرف باغ ہی باغ تھے اور زمین پر بچھی ہوئی گھاس سے ہرا ہوا تھا۔ یہ باغ بھی اسی عمارت کا حصہ تھے، اور وہاں لوگوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کس طرح لوگ ناچ گا رہے، کھیل رہے تھے تو کسی طرف پیچ۔ معلوم نہیں کہاں سے میرا پرانا سائیکل مجھے مل گیا اور میں سائیکل پر سوار ہو کر باہر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگ پڑی۔ باغوں کے کنارے کنارے سائیکل چلاتی میں جس طرف بھی جاتی، وہاں آگے پتھر کی دیوار آجاتی اور مجھے باہر جانے کا راستہ نہ ملتا۔ میں پھر کسی اور طرف سائیکل موڑتی، لیکن وہاں بھی اخیر میں ایک دیوار آجاتی اور مجھے باہر جانے کا راستہ نہ ملتا۔۔۔ اسی گھبراہٹ میں میری نیند کھل گئی۔

٢

سپید سنگ مرمر کا ایک بت میرے سامنے پڑا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتی رہی، اور پھر میں نے اس سے کہا "مجھے تمہارا کیا کرنا ہے؟ نہ تم بولتے ہو، نہ سانس لیتے ہو ــــ آج میں تم کو توڑ دوں گی ــــ ریزہ ریزہ کر دوں گی ــــ تم نے میری ساری عمر گنوا دی ہے ــــ میرا تصور . . . . میرا منتہائے مقصود . . . ." اور جب میں نے زور سے اس بت کو پرے پھینکا، میرے اپنے ہی زور سے مجھے جاگ آگئی۔

٣

میں نے دیکھا، میرے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کوئی بیس کا سن ہوگا۔ دبلی لمبی اور اس کا ایک ایک نقش جیسے کسی نے بڑی محنت سے تراشا ہو۔ لیکن اس کا رنگ سیاہ اور تاباں ــــ جیسے کسی نے سیاہ پتھر کو تراش کر ایک بت بنایا ہو۔ "یہ کون ہے؟" کسی نے مجھ سے پوچھا۔ "میری بیٹی!" میں نے جواب دیا۔ پوچھنے والا کون تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس نے پھر حیران ہو کر پوچھا "میں نے تمہارے دو بچے دیکھے ہوئے ہیں، وہ بڑے خوبصورت ہیں۔ خوبصورت تو یہ بھی ہے لیکن اس کا رنگ . . . ." کہا "وہ دونو چھوٹے ہیں۔ ان کا رنگ گورا ہے۔ یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے . . . . تمہیں معلوم ہے کہ پاربتی نے ایکبار اپنے بدن کی کثافت کو اکٹھا کر کے ایک بیٹا ــــ گنیش بنالیا تھا ــــ میں نے اپنے دل کے سارے

غضب کو بٹ کر یہ بیٹی بنائی ہے . . . . میرا فن، میری کارگذاری . . . . "

۴

میں ایک اجاڑ بیابان میں سے گذر رہی تھی۔ مجھے کسی کی شکل نظر نہ آئی لیکن ایک آواز آئی۔ کوئی گا رہا تھا —— "بُرا کیتو ای صاحباں، میرا ترکش ٹنگیا ای جنڈ" میں نے اجاڑ میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کون ہو؟" جواب ملا —— "میں بہادر مرزا ہوں۔ صاحباں نے میرے تیر چھپا رکھے اور مجھے لوگوں کے ہاتھوں بن آئی موت مروا دیا" میں نے پھر چاروں طرف دیکھا، لیکن مجھے کسی کی شکل نظر نہ آئی۔ میں نے جواب دیا۔ "کبھی کبھی کہانیاں پہلو بدل لیتی ہیں۔ آج ایک مرزے نے میرے تیر چھپا رکھے ہیں، اور مجھے، بہادر صاحباں، کو اَن آئی موت مروا دیا ہے۔"

۵

بادل بڑے زور سے گرجے۔ سارا آسمان کانپ رہا تھا۔ اور پھر میرے دائیں ہاتھ پر بجلی گر پڑی۔ میرے بدن کو ایک سخت جھٹکا لگا اور پھر میں نے سنبھل کر اپنے ہاتھ کو ہلا کر دیکھا۔ ہاتھ بالکل ٹھیک تھا۔ صرف ایک جگہ سے تھوڑا لہو برس رہا تھا۔ جیسے ایک کھرونچ آگئی ہو۔ دوسری بار پھر بجلی کڑکی اور میرے اسی ہاتھ پر گر پڑی۔ پھر ایک سخت جھٹکا لگا اور میں نے جب ہاتھ کو ہلا کر دیکھا، وہ بالکل صحیح و سالم تھا، صرف ایک جگہ اس طرح تھا جیسے معمولی سی رگڑ آگئی ہو۔ تیسری بار پھر آسمان پھٹ گیا اور میرے اسی ہاتھ پر بجلی گری۔ سخت جھٹکا لگا، لیکن اس کے بعد میں نے جب ہاتھ کو ہلایا، ہاتھ ہلتا ضرور تھا لیکن ایک انگلی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس انگلی کو دبایا۔ بار بار سہلایا اور وہ سیدھی ہو گئی، اپنی جگہ پر ٹھیک ہو گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں قلم پکڑ کر دیکھی، میرا ہاتھ بالکل ٹھیک تھا، میری قلم ابھی بھی لکھتی تھی۔ اس وقت میرے دل کی حالت بادلیئر کے دل ایسی تھی جب اس نے "سندرتا کا ورد" لکھا تھا:

تم اونچے آسمان میں سے اتری ہو یا گہرے پاتال سے نکل ہو!
تمہاری نگاہ بالکل شراب، شیطان ایسی بھی، فرشتہ ایسی بھی۔
تمہاری آنکھوں میں شام بھی، صبح بھی۔
تمہاری خوشبو، جیسے شام کی آندھی۔

تمہارے ہونٹ، شراب کا ایک گھونٹ۔ تمہارا منہ ایک جام۔
تم کسی نار گفا سے ابھری ہو کہ ستاروں سے پیدا ہوئی ہو؟
تم ایک ہاتھ سے مسرت بھیجتی ہو۔ دوسرے سے تباہی۔
تمہارے زیوروں کی چھنک کتنی خوفناک!
تمہاری ہم آغوشی، جیسے کوئی قبر میں اترتا جائے ——

اسی سال کے شروع میں ۲۶ جنوری کے ریپبلک ڈے پر بھارت سرکار کی طرف سے نیپال گئی تھی۔ لیکن دل کی بڑی اکھڑی ہوئی حالت میں، اور وہاں سے دو خط امروز کو لکھے تھے۔

یہ ہیں:

.... اکل نیپال نے میری اس قلم کو عزت بخشی جس قلم کے ساتھ میں نے تیرے لیے محبت کے گیت لکھے اس لیے مجھے جتنے پھول ملے، میں نے سارے تمہاری یاد پر چڑھا دئے۔ "ہجر دی اس رات وچ کجھ روشنی آ وندی پئی"۔ اس میری نظم میں تمہاری یاد کی بتی جل رہی تھی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک اس روشنی کا ذکر ہوتا رہا۔ پاس میں کتنی ہی نیپالی، ہندی اور بنگالی نظمیں جاگ رہی تھیں۔ ایک فارسی کا شعر تھا جس کا مطلب تھا —— ریگستان میں ہم لوگ دھوپ سے چمکتی ریت کو پانی سمجھ کر دوڑتے ہیں۔ مغالطہ کھاتے ہیں، تڑپتے ہیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں، ریت ریت ہے پانی نہیں بن سکتی، اور کچھ دانا لوگ اس ریت کو پانی سمجھنے کی غلطی نہیں کرتے۔ وہ لوگ دانا ہو گئے لیکن میں کہتا ہوں، جو لوگ ریت کو پانی سمجھنے کی غلطی نہیں کرتے، ان کی پیاس میں ضرور کوئی کسر ہو گی!" —— سچ میرے چھلاوے! میری دانائی میں کوئی کسر ہو سکتی ہے، لیکن میری پیاس میں کوئی کسر نہیں .....

۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء

۲۷ جنوری ۱۹۶۰ء

...... اراہی! تم شام کے وقت کیوں ملے؟ زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ تم نے ملنا تھا تو زندگی کی دوپہر میں ملتے، اس دوپہر کی حدت تو دیکھ لیتے: کھٹمنڈو میں یہ کسی نے ہندی نظم پڑھی تھی۔ ہر ایک کا سوز اپنا اپنا ہوتا ہے۔ لیکن کئی بار اس سوز کے

جتنے مل جاتے ہیں ۔ یہ میرا انتظار رہتا ہے ۔ کئی در و دیواروں کے ساتھ ٹھوکر کھا کر میں نے زندگی تلاش کی ہے ۔ پچھلے چودہ برس اسی طرح بیت گئے اور معلوم ہوتا ہے میری زندگی کے رہتے برس بھی اسی انتظار میں جائیں گے ..... (فروری ۱۹۶۰ء)

۱۹۶۱ء

اس سال کے آغاز میں دل کی جو حالت تھی ۔ اس کو ان دنوں ان الفاظ میں لکھا تھا ـــ

"ہندو دھرم کے مطابق زندگی کے چار پڑاؤ ہوتے ہیں ، چار ورن ، چار آشرم" ۔ ان کے متعلق مجھے زیادہ علم نہیں ، لیکن زندگی کے سفر میں میں نے اپنی قلبی و ذہنی حالت کے چار پڑاؤ ضرور دیکھے ہیں ۔ اور ان کے بارے میں میں کچھ تفصیل کہہ سکتی ہوں ۔

پہلا پڑاؤ تھا لاشعور ۔ یہ ایک بچے کی ذہنی حالت ایسا تھا جس کو ہر چیز اچھی لگتی ہے جس کو چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ بڑی سے بڑی دلچسپی جاگ پڑتی ہے ۔ اور جو جھٹ بلک اٹھتی ہے اور جھٹ بہل جاتی ہے ۔

دوسرا پڑاؤ تھا شعور یہ ایک گداز بدن ، خود رو جوانی کی مانند تھی جس کا غضب بڑا قوی ہوتا ہے ، بڑا خونبار ۔ جو زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ جب بگڑ بیٹھتی ہے ، ماننے میں نہیں آتی ۔ اور جو سانپ کی طرح نفرت کو منی سمجھ کر اپنی پیشانی میں سنبھال رکھتی ہے ۔

تیسرا پڑاؤ تھا دلیری ۔ حال کو ادھیڑنے والی اور مستقبل کو سینے والی دلیری ۔ خوابوں کو تاش کے پتوں کی طرح ملا کر اور بانٹ کر کوئی کھیل کھیلنے کی دلیری جس کی کوئی بھی ہار دائمی ہار نہیں ہوتی ، جس کے پتے پھر سے ملائے جا سکتے ہیں اور جیت کی امید پھر سے باندھی جا سکتی ہے ۔

اور اب چوتھا پڑاؤ ہے تنہائی ۔

تین چار سال پیشتر جب ویت نام کے صدر ہو چی منہہ دہلی آئے تھے تو ایک ملاقات میں انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دے کر کہا تھا "ہم دونوں دنیا کی غلط قیمتوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں ، میں تلوار کے ساتھ ، تم قلم کے ساتھ" ـــ اور ہو چی منہہ کی شخصیت کا میرے اوپر اس قدر گہرا اثر پڑا تھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے ایک نظم لکھی جو ویت نام

میں ۲۶-۵-۱۹۵۸ کے اخبار NHAN DAN میں شائع ہوئی تھی، لیکن یہ نہیں معلوم، وہ ہوچی منہ کی نظر سے گزری تھی یا نہیں۔ اور پھر دہلی ریڈیو کے لیے جب "دنیا کے کچھ لوک گیت" ترجمہ کر کے اس سیریز میں پیش کئے، تو ان کو کتابی صورت میں چھاپنے کے وقت وہ کتاب "آشنا" ہوچی منہ کے الفاظ کو دہراتے ہوئے ان کی ہی نذر کر دی تھی۔ پہلی مارچ ۱۹۶۱ء کو جب ویت نام سے مجھے ہوچی منہ کی تار آئی "

"I send you my friendliest admiration and kindest greetings"

تو دل کی رو کچھ بدل لی۔ ساتھ ہی ایک وہ انگریزی فلم یاد آنے لگی، جس میں ملکہ الزبتھ ایک حسین نوجوان کو دل ہی دل میں پیار کرتی ہے۔ اس کو جب بحری جہاز دے کر ایک مہم سونپتی ہے، تو دور سے دوربین کے ذریعے جاتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ اس نوجوان کی محبوبہ بھی جہاز پر اس کے ہمراہ ہے۔ وہ دونو ڈیک پر کھڑے ہیں۔ اس وقت ملکہ کو پریشان و آزردہ دیکھ کر اس کا ایک خیرخواہ کہتا ہے —— "میڈم! لک اپ بٹ ہائر" —— اوپر، اس نوجوان اور اس کی محبوبہ کے سروں سے اوپر، ملکہ کی حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے —— اور میں اپنے آپ کو خود ہی کہتی —— "امرتا! لک اپ بٹ ہائر!" —— اور میں زندگی کی ساری شکستوں اور پریشانیوں سے اوپر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی —— جہاں میری تحریریں تھیں، میری نظمیں، کہانیاں، میرے ناول . . . .

اس سال زندگی نے بھی میری مدد کی، میری نگاہ بلندی کی لائی۔ مارچ میں ہی ماسکو کی رائٹرز یونین کی طرف سے دعوت ملی، اور ازبک شاعرہ زلفیا خانم کا خط کہ تاشقند میں میں اس کے گھر اس کی مہمان رہوں۔ یہ سارا کریڈٹ اپنے روسی دوستوں کو دیتی ہوں کہ انھوں نے میرے دل کے بڑے نازک موقعہ پر مجھے دعوت دے کر مجھے اداسی کی گہری دلدل میں سے نکال لیا۔ میں ۲۳-۲۲ اپریل کو تاشقند چلی گئی۔ میری اس وقت کی ۱۹۶۱ کی ڈائری میں کئی پیارے لمحات کی یادیں منقوش ہیں ——

○ زلفیا کے دل کا جام محبت سے لبریز ہے، اور دسترخوان پر بلور کا پیالہ اناروں کے رس سے۔ دونوں سرخ پیالوں سے باری باری گھونٹ بھرتی میں ازبک کتابوں کے اوراق پلٹتی رہی۔ میرے اور کتابوں کے درمیان زبان کی دیوار ہے۔ لیکن یہاں

کتاب کی جلد پر ایک پیاری لڑکی کی تصویر ہے۔ جس کی آنکھ میں آنسو لٹکا ہوا ہے۔ لگا وہ آنسو زبان کی دیوار پھلانگ کر میری گود میں آگرا۔ میں نے کہا ــــ "زلفیا! ان آنسوؤں کا اور عورتوں کی آنکھوں کا معلوم نہیں، کیا رشتہ ہے۔ کوئی ملک ہو، یہ رشتہ بڑی دنا نبھاتا معلوم ہوتا ہے ....." زلفیا نے کہا ــــ "جب دو ہستیوں کو اس رشتے کی سمجھ لگ جائے تو اس سمجھ صدقہ ان کے بیچ میں بھی ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ امرتا اور زلفیا بھی جیسے ایک عورت کے دو نام ہیں ....." اور زلفیا نے میرے لیے انیسویں صدی کی ازبک شاعرہ نادرہ کے کلام پڑھے۔ اور ہم کتنی دیر نادرہ اور مہجونا کی شاعری میں ڈوبی رہیں .....

آج سمرقند میں ایک شاعر عارف لالہ کے دو پھول لایا اور ہم دونو کو دیئے۔ دونو کا رنگ سرخ تھا اور ایک سی خوشبو تھی۔ لیکن میں نے اور زلفیا نے آپس میں وہ پھول بدل لیے جیسے میرے ملک میں دو سہیلیاں دو پٹے بدل لیتی ہیں۔ زلفیا کہنے لگی ــــ "دو پھول، لیکن ایک خوشبو! دو ملک، دو زبانیں، دو دل، لیکن ایک دوستی ....."

پھر پل بھر بعد زلفیا کہنے لگی ــــ "لیکن ان پھولوں میں درد کا کوئی داغ نہیں ہمارے دلوں میں درد کے داغ ہیں ....."

مجھے نادرہ کا وہ شعر یاد آیا جس میں وہ بلبل سے کہتی ہے کہ اگر تمہارے گلے میں گیت ختم ہو گئے ہیں، تو اس نادرہ کے کلام میں سے فریاد لے جا۔ اور میں نے کہا ــــ "میں گل لالہ سے کہتی ہوں، اگر تم کو اپنے دل کے لیے سوز کے داغ نہیں ملے، تو مجھ سے یا زلفیا سے کچھ داغ قرض لے جا۔" زلفیا کو کچھ یاد آگیا۔ کہنے لگی ــــ "ہاں سچ! لالہ کے وہ پھول بھی ہوتے ہیں جن کے سینے میں سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ چل، کھیتوں میں وہ پھول تلاش کریں۔" پھر میں اور زلفیا کھیتوں کے کنارے چلتی وہ داغدار پھول ڈھونڈتی رہیں ....

ایک ازبک مرد، نبی جان، میرا مترجم، ساتھ تھا۔ اس نے لالہ کا ایک خاص پھول ڈھونڈ کر پیش کیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "اس پھول کے سینے میں ہجر کے سیاہ داغ تو نہیں، لیکن روشنی کے ریشمیں داغ ضرور ہیں ....." پھول کی پنکھڑیوں میں چھپے ہوئے سچ مچ سلگی رنگ کے نشان تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور زلفیا سے کہا ــــ "

داغ شاید اس لیے تابان ہیں کہ ان میں یاد کی بتی جل رہی ہے . . . " زلفیا مسکرائی ۔ کہنے لگی ۔" امرتا! کیا یہ یاد ہماری اپنی ہی اختراع نہیں؟ ورنہ یہ مرد . . . . " اور ہم دل کی باتیں بیچ ہی میں چھوڑ کر اپنی نظموں، اپنی کہانیوں کی باتیں کرتی رہیں . . . .

تاشقند میں آج کل ـــــ ہندوستان سے اردو شاعر علی سردار جعفری بھی آئے ہوئے ہیں ۔ آج اتفاق سے مل گئے تو زلفیا نے ان کو اپنے گھر دعوت پر بلایا ۔ دعوت میں ایک ٹوسٹ پیش کرتے ہوئے زلفیا نے کہا ـــــ " ہمارے ملک میں چھوٹی لڑکی کو خان اور بڑی کو خانم کہتے ہیں ۔ اس طرح امرتا کا نام بنتا ہے، امرتا خانم! اگر ہم امرتا لفظ کا ازبیک ترجمہ کریں تو بنتا ہے، اُلمس ۔ سو میں اُلمس خانم کے نام ٹوسٹ پیش کرتی ہوں "۔ جواب میں علی سردار جعفری نے زلف لفظ کا ترجمہ ہندی میں کیا ۔ الکا ۔ اور زلفیا کے نام کا عبارتی روپ بناتے ہوئے ٹوسٹ پیش کیا ۔ الکا کماری کے نام! " ٹوسٹ پیش کرنے کی میری باری آئی تو میں نے نظم کی دو سطریں پڑھیں ـــــ

عرصہ سے بچھڑی قلم جس طرح جوشِ محبت کے ساتھ کاغذ کے گلے لگی،

رازِ عشق کھلتا جائے " ۔ ایک سطر پنجابی میں ۔ ایک سطر ازبیک میں سستی جائے ۔ پھر قافیہ ملتا جائے . . . . .

ازبکستان کی ایک وادی کا نام خوابیدہ حسینہ ہوا کرتا تھا، سوئی ہوئی پری ۔ لیکن اب جبکہ وہ سوشلسٹ حکومت کے بعد کام سے بیاہی گئی ہے تو اس کا نام فرغانہ وادی ہو گیا ہے ۔ یہاں ریشم کی ملیں ہیں ۔ لوگ کہتے ہیں ـــ " ایک سال میں یہ وادی جتنا ریشم بنتی ہے، اگر اس کا ایک سرا زمین پر رکھیں تو دوسرا سرا چاند تک پہنچ جاتا ہے . . . .

ریشم کی ان ملوں کی ڈائرکٹر عورتیں ہیں ۔ انہوں نے اپنی ملیں دکھاتے ہوئے مجھے چلبلے رنگین ریشم کا کپڑا تحفے کے طور پر دیا اور مجھ سے کوئی پیغام مانگا ۔ کل پہلی مئی ہے، دنیا بھر کے مزدوروں کا دن ۔ اس لیے دو سطروں کی نظم میں یہ پیغام دیا ۔

اے ریشم بنتی لڑکی! مئی کا مہینہ پورا آ گیا ہے تمہاری لاکھوں مادب پوری ہوں ۔

اے خواب بُننے والی لڑکی! اپنی ٹوکری میں میری لاکھ دعائیں رکھ لے ۔

اینا خان نے دسترخوان پر کونیاک، شہد اور اناروں کا رس پروس کر مجھ سے پوچھا

"ہماری مہمان! میں تمہارے لیے کیا گاؤں؟" میں نے کہا "اپنا! اپنے ملک کا وہ گیت گا جو کونیاک ایسا تلخ ہو، شہد ایسا شیریں اور اناروں کے رس ایسا سرخ...."

وہ ہنس پڑی "اچھا! اور پنیر کے بھنے ہوئے گوشت ایسا عاشق گیت!" اس نے اور لالہ خانم نے آج بہت پیارے گیت گائے۔ آخر میں لالہ خانم نے یہ بھی گایا۔ "یہ ہمارے ماتھے کے نصیب کہ ہم نے تجھ کو ڈھونڈ لیا۔ آج تو ہمارے ملک کا مہمان ہے..."

ان دسترخوان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے دل کی تہیں بھی ان کے پیار سے بھیگ گئیں۔ کہا "کبھی میں نے گیت لکھا تھا کہ زندگی مجھے اپنے گھر بلا کر مہمان نوازی کرنا بھول گئی۔ لیکن آج میں اپنا یہ شکوہ واپس لیتی ہوں...."

○ آج تاشقند سے سٹالن آباد آئی ہوں، زلفیا ساتھ نہیں آسکی، اکیلی آئی ہوں۔ ہوائی اڈے پر کتنے ہی تاجک ادیب آئے ہوئے ہیں۔ ان میں تاجکستان کے سب سے بڑے شاعر مرزا ترسن زادے بھی ہیں..... ان سے مل کر میں نے کہا "عظیم تاجک شاعر کو میرا سلام! لیکن آپ کے سینے لگے ہوئے ایک اور سلام کی میں قاصد بھی ہوں۔ وہ سلام زلفیا کا ہے۔ ہمارے اردو شاعر فیض احمد فیض کے لفظوں میں" شاعر لکھتا ہے تیرے حسن کے نام! "تب ترسن زادے بہت ہنسے۔" ایک سلام زلفیا کا، دوسرا فیض کے لفظوں میں، تیسرا اس طرح کے قاصد کے ہاتھوں..... میرا کیا حال ہوگا؟"

شہر سے بیس میل دور، پہاڑ کے عقب میں، ایک دریا کے کنارے ادیب گھر بنے ہوئے ہیں۔ اس دریا کا نام ہے ورزآب (رقصاں پانی) یہاں آج تاجک ادیبوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ امن کے، دوستی کے، اور قلموں کی امیری کے نام جام بھرتے ہوئے اور ٹوسٹ دیتے ہوئے ـــــ سب نے باری باری بڑی پیاری نظمیں پڑھی ہیں..... پھر اچانک ننھی ننھی بوندیں گرنے لگیں تو مرزا ترسن زادے نے کہا "آج ہم نے مٹی میں دو ملکوں کی دوستی کا بیج بویا ہے، اس لیے آسمان پانی دینے آیا ہے...."

ایک شاعر نے پوچھا "آپ کے ملک میں، سنا ہے، ایک معشوقوں کا دریا ہے۔ اس کا کیا نام ہے؟"

میں نے بتایا "چناب" اور کہا "آپ کے ملک میں ورزآب، دیکھ لیجئے

ہمارے دریاؤں کے قافیے بھی ملتے ہیں۔"

آذر بائیجان کے دار الخلافہ، باکو، میں بھی بڑے اچھے لوگ تھے۔ شناس کرائی کی شاعر عورتیں، —— نگار خانم، قریب ۲۵ کتابوں کی مصنفہ مروارد خانم دلباز، اور ایرانی شاعرہ مدینہ گلگن۔ ان تینوں میں میں جو پہلی دوستی کی طرح مل گئی تو اپنی نظمیں پڑھتے ہوئے ہم نے دور ازبکستان میں بیٹھی زلفیا کو بھی یاد کیا۔ اس کی نظم پڑھی تو وہاں کے مشہور شاعر رسول رضا نے جو ٹوسٹ پیش کیا، وہ ابھی تک میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔
—— "یہ تو پانچ شاعر خواتین گھل مل گئیں، پانچ پانیوں کی طرح، اور یہاں آذر بائیجان کے دار الخلافہ باکو میں پورا پنجاب بن گیا۔ اس لیے میں پنجاب کے تحفظ کا جام پیتا ہوں۔"

اسی محفل میں بارھویں صدی کی ایک آذری شاعرہ مہستی گنجوی کا کلام بھی پڑھا گیا۔ اور میں نے اس محفل کو "آٹھ صدیوں کی محفل" کہہ کر کہا —— "کبھی میں نے نظم لکھی تھی — مل گئی تھی اس میں ایک بوند تیرے عشق کی، اس لیے میں نے عمر کی ساری تلخی پی لی —— لیکن آج اس محفل میں بیٹھے مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری عمر کے پیالے میں انسانی محبت کی بہت سی بوندیں آمیز ہو گئی ہیں، اور عمر کا پیالہ شیریں ہو گیا ہے۔"

سفر کی ڈائری

"گنگا جل سے لے کر ووڈکا تک" یہ سفرنامہ ہے میری پیاس کا" اس دل کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے کئی ملکوں کے سفر کا ذکر بھی اس میں شامل ہے، لیکن ان حسین یادوں کا آغاز جس روز ہوا تھا، وہ دن میرے اور اس دنوں کی ایک خوفناک یاد ہے جیسے سویرا ہونے سے قبل رات اور سیاہ ہو جاتی ہے —— ان دنوں میں دہلی ریڈیو میں ملازمت کرتی تھی۔ ایک شام دفتر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ سجاد ظہیر ملنے آئے۔ کچھ دیر ہچکچاہٹ میں خاموش رہے، پھر متامل لہجے میں کہنے لگے —— "ہندوستان ادیبوں کا ایک ڈیلیگیشن سوویت روس جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں — تم بھی اس ڈیلیگیشن میں شامل ہو۔ کل کی میٹنگ میں کسی زبان کے کسی ادیب نے تمہارے نام پر اعتراض نہیں کیا، لیکن پنجابی ادیبوں نے سخت اعتراض کیا ہے ..." اور انہوں نے اور بھی متامل لفظوں میں بتایا ... "کہتے ہیں، اگر امرتا ڈیلیگیشن میں ہوئی، تو ہماری عورتیں [illegible]

ڈیلیگیشن کے ساتھ نہیں جانے دیں گی . . . . . میں عجیب مشکل میں پڑ گیا ہوں . . . . . "

اس واقعہ کو بعد میں میں نے "دلی کی گلیاں" ناول میں صفحہ ۷۷ پر درج کیا تھا ، اس میں سجاد ظہیر کا نام راج نارائن لکھا تھا ۔ اس روز جب سجاد ظہیر نے اپنی یہ مشکل بتا کر کہا کہ اگر میں ان کی کمیٹی کے نام ایک خط لکھ دوں کہ میں وفد کے ساتھ جانا چاہتی ہوں تو وہ کمیٹی کی اوپن میٹنگ میں یہ خط پیش کر کے میرے جانے کا فیصلہ کر لیں گے ۔ تو میں نے ان کو جواب دیا تھا —— "آپ نے ناحق آنے کی تکلیف اٹھائی ۔ آپ نے کیسے خیال کر لیا کہ میں کسی وفد کے ہمراہ جانا چاہونگی ۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا ہوا ہے حبب بھی کسی ملک میں جاؤں گی ، اکیلی جاؤں گی ۔ سوویت روس کو اگر میری ضرورت ہوگی ، تو مجھے اکیلی کو دعوت بھیج دیں گے ، ورنہ نہ سہی ۔ "

۱۹۶۰ میں ماسکو کی رائٹرز یونین کی جانب سے مجھے اکیلی کو بلاوا آیا اور اپریل ۱۹۶۱ میں میں تاشقند ، تاجکستان ، ماسکو اور آذر بائیجان گئی تھی ۔ پھر ۱۹۶۶ میں بلغاریہ والوں نے مجھ اکیلی کو دعوت بھیجی تھی ، اور میں بلغاریہ اور ماسکو گئی تھی ۔ اسی سال کے آخر میں جارجیا کے شاعر شوتا رستاولی کا آٹھ سو سالہ جشن تھا جس کے لیے میں ۱۹۶۶ میں پھر ماسکو ، جارجیا اور آرمینیا گئی تھی ، اکیلی ۔ ۱۹۶۷ میں ہماری سرکار نے ثقافتی تبادلے میں مجھے یوگوسلاویہ ، ہنگری اور رومانیہ بھیجا تھا ، ہر ملک میں تین تین ہفتہ کے لیے ۔ اور وہاں سے بلغاریہ نے اپنے خرچ پر مجھے اپنے دیس میں بلا لیا تھا اور مغربی جرمنی نے اپنے خرچ پر اپنے دیس میں ۔ اور واپسی پر طہران نے کچھ دنوں کی دعوت دے دی تھی ۔ ۱۹۶۹ میں نیپال میں اپنی انڈین ایمبیسی کی دعوت پر نیپال گئی تھی ۔ اور ۱۹۷۲ میں یوگوسلاویہ کی خصوصی مانگ پر ہماری سرکار نے کلچرل ایکسچینج کے سلسلہ میں پھر مجھ کو تین ملکوں میں تین تین ہفتوں کے لیے بھیجا —— یوگوسلاویہ ، چیکوسلواکیہ اور فرانس ، جہاں سے اپنے خرچے پر میں لندن اور اٹلی بھی جا سکی ۔ واپسی پر مصر نے قاہرہ میں ایک ہفتہ کی دعوت دے دی ۔ اس طرح واپسی پر وہاں بھی جا سکی تھی ۔ اور اس کے بعد ۱۹۷۳ میں ورلڈ پیس کانگریس کے موقعہ پر ماسکو گئی تھی اور ۱۹۷۶ میں مارشس ۔

مجھے ڈائری لکھنے کی عادت نہیں ، تاہم سفر میں ضرور لکھتی ہوں ۔ اس میں کئی یادیں میرے سامنے درج ہیں

میری ڈائری کے صفحات پر عجیب تنہائی کا احساس ہے۔ ہوائی جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھنے پر لگتا ہے، جیسے کسی نے آسمان کو پھاڑ کر اس کے دو حصے کر دیئے ہوں۔ لگتا ہے — پھٹے ہوئے آسمان کا ایک حصّہ میں نے نیچے بچھا لیا ہے، ایک اپنے اوپر لے لیا ہے ..... ماسکو پہنچنے میں ابھی چند گھنٹے رہتے ہوں، لیکن خیال کا، تنہائی کے پاس سے چل کر کہیں پہنچنے میں ابھی پتہ نہیں، کتنا وقت رہتا ہے ....

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء

جہاں تک نگاہ جاتی ہے، زمین پر بادلوں کے کھیت اُگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی جگہ فاصلہ چھوڑتے ہوئے جیسے بادلوں کے بیج کم پڑے ہوں۔ لیکن کسی جگہ اس قدر گنجان ہیں جیسے بادلوں کی کھیتی بڑی بھرپور ہوئی ہو۔ اور ان کھیتوں میں سے گذرتا ہوا، ہوائی جہاز بادلوں کی کٹائی کرتا معلوم ہوتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے جیسے گندم کے کھیتوں میں گھومتے ہوئے گندم کا دانہ مونہہ لگانے سے آدم بہشت میں سے نکالا گیا تھا، اسی طرح بادلوں کے کھیتوں میں چلتے ہوئے، ان کھیتوں کی مہک پی کر، آج آدم زمین سے نکالا گیا ہے ....

صوفیہ کے ہوائی اڈے پر بالکل اجنبی بن کر کھڑی ہوں۔ دفعتًہ کسی نے سرخ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں تھما دیا ہے اور ساتھ ہی دریافت کیا — "تم امرتا؟" اور میں سرخ پھولوں کی انگلی پکڑ کر اجنبی چہروں کے شہر میں چل پڑی ہوں ....

۲۵ مئی ۱۹۶۶ء

ابھی ابھی بلغاریہ کے قومی رہنما گیے اورگی دمتروف کو دیکھا ہے جس کی روح لوگوں نے اپنی روحوں میں ڈال لی ہے، اور جس کا جسم سائنس کی مدد سے سنبھال لیا ہے.... اس کو ۱۹۳۳ میں ہٹلر نے قید کر لیا تھا۔ اس وقت ادیبوں کی طاقت نے ہی اس کو بچانے کے لیے زور لگایا تھا۔ فرانس کے روماں رولاں نے اس کو بچانے کے لیے قلمی جہاد شروع کیا تھا، اور اس نے آزاد ہو کر پھر ۱۹۴۴ میں بلغاریہ کو فاسسٹ حکومت کے پنجہ سے آزاد کروا لیا۔ آج لوگ مجھے کہہ رہے ہیں — "یہ ہمارا دمتروف تمہارے گاندھی ایسا ہے"، تمہارے نہرو ایسا ....

۲۵ مئی ۱۹۶۶ء

اپنے ملک کو جرمن جوئے سے آزاد کرانے والے بلغارین سپاہیوں کے بت دیکھ رہی ہوں۔ تین کلومیٹر لمبے اور اتنے ہی چوڑے دائرے میں بنا، بتوں کا یہ باغ آزادی کا باغ کہلاتا ہے ...... یہ بت غلام زندگی کے دردوں کی اور آزاد زندگی کے عشق کی منہ بولتی تصویریں ہیں ....

۲۶ مئی ۱۹۶۶ء

آج دوپہر غیر ممالک کے ساتھ ثقافتی تعلقات کے محکمے کے نائب صدر پروفیسر سٹیفن سٹانچیف کے ساتھ بڑی دلچسپ ملاقات ہوئی۔ بڑے سنجیدہ انسان ہیں، اس لیے پریس کے سنسر کے بارہ میں باتیں کر سکی۔ کہا "یہ درست ہے کہ تحریر و تقریر کی آزادی میں جب تک لکھنے بولنے والے کو ذمہ داری کی پہچان نہیں ہوتی۔ تب بڑا کچھ غلط بھی وجود میں آ جاتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو سوچ رہی ہوں۔ جو تحریر ذمہ دار ہو، لیکن الگ خیالوں اور الگ نظریوں کی وجہ سے الگ طرح کی ہو، اس کا کیا بنے گا؟"

ان کا جواب بھی سنبھالا ہوا ہے ____ "ہمارا ادارہ نگاہ کی وسعت کا حامل ہے، نئے تجربات کو قبول کرتا ہے۔ تاہم ممکن ہے، اس کی حد بندی کچھ اچھی تحریروں کے لیے نقصان دہ بھی ہو..... لیکن غیر صحت مند ادب کے وجود میں آنے کے مقابلہ میں یہ کم نقصان دہ ہے ....." جانتی ہوں، وقت کھڑا نہیں رہ سکتا، سوال بھی کھڑا نہیں ہو سکتا، یہ سوشلسٹ نظام میں بھی راستہ تلاش کرے گا۔ آج کی بات چیت کا ماحول خوش گوار ہے، مسٹر سٹانچیف کہہ رہے ہیں ____ "بد سے بہتر تک پہنچے ہیں، بہترین تک بھی رسائی کریں گے ...."

۲۷ مئی ۱۹۶۶ء

آج بلغارین ادیبوں کی محفل میں نظمیں پڑھیں۔ معانی کی تہ میں اتر جانے کے لیے زبان کی مجبوری کا بند دروازہ کبھی بلغاری، کبھی روسی اور کبھی فرانسیسی لفظوں کے ساتھ کھولا جا رہا تھا کہ وہاں یوگوسلاویہ سے مہمان آئے زلاٹکو گوریان نے میری سب سے بڑھ کر امداد کی۔ گوریان کو فرانسیسی اور جرمن سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا طویل تجربہ ہے، اس لیے آج اس نے مجھ پر بڑا پیارا سا احسان کیا ہے۔ "میں تمہارا سب سے اچھا دوست ہوں۔

تم ـــــ یوگوسلاویہ کے اس دوست کو یاد رکھنا، اس نے تمہاری نظموں کے معانی سمجھنے میں بڑی مدد کی ہے . . . . ."

۲۹ مئی ۱۹۶۶ء

آج بلغاریہ کے عظیم ادیبوں آئیوان وازوف، پیو یاوروف اور نکولا واپتساروف کے تاریخی گھروں کو دیکھا۔ واپتساروف کی نظموں کا پنجابی ترجمہ میں نے کئی سال ہوئے کیا تھا، وہ میری ترجمہ کی ہوئی کتاب بھی اس کے تاریخی گھر میں پڑی ہوئی ہے۔ آج اس کے میز کا، قلم کا، اس کی چائے کی کیتلی کا لمس حاصل ہوا تو آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ محسوس ہوا کئی سال پہلے جب میں نے اس کی نظموں کا ترجمہ کیا تھا، اس وقت سے، اس کی کئی سطریں جو کانوں میں پڑیں، شاید کانوں میں ہی کھڑی رہ گئی تھیں کہ آج سُلگ پڑیں ـــــ "کل کو یہ زندگی دانش مند بنے گی . . . . . یہ یقین میرے سینے میں بیٹھا، اور جو اس یقین کو چھید سکے، وہ گولی کہیں نہیں . . . . . وہ گولی کہیں نہیں . . . . ." یہ سطریں اس نے ۱۹۴۲ء میں فاسسٹوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے لکھی تھیں ـــــ لگا، اس یقین کو جیسے جب سے دنیا بنی ہے، گولی نہیں چھید سکی، . . . . آج ہاتھ سے چھو کر دیکھ رہی ہوں . . . .

۲۹ مئی ۱۹۶۶ء

صوفیہ سے ۱۶۰ کلومیٹر دور بطق گاؤں میں بنے اس چرچ کے اندر کھڑی ہوں، جہاں ۱۸۷۶ میں ترک حکومت کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرتے گاؤں کی دو ہزار عورتوں اور بچوں نے پناہ لی تھی اور اپنے تحفظ کی کوشش کی تھی ـــــ وہ کنواں دیکھ رہی ہوں، جو چرچ کے گرد گھیرا پڑ جانے کی وجہ سے چرچ میں بند پیاسے لوگوں نے اپنے ناخنوں سے کھود کھود کر پانی نکالنے کی سعی و جہد کی تھی۔ یہ سارے، ۱۷ مئی کو دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے ـــــ دو ہزار انسانوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں شیشے کے ڈھکنوں کے نیچے سنبھال کر رکھی دکھائی دے رہی ہیں۔ دیواروں میں ہمارے پنجاب کے جلیانوالہ باغ کی دیواروں میں پڑے ہوئے گولیوں کے نشانوں ایسے نشان ہیں . . . . .

۳۱ مئی ۱۹۶۶ء

آج پلوودِف قصبہ میں وہ پرنٹنگ مشین دیکھی جس پر غلامی کے خلاف ادب چھپا

کرتا تھا۔ حکومت سے چوری۔ اور وہ بیڑیاں دیکھیں جن میں انسان باندھے جا سکتے تھے، لیکن وقت نہیں۔۔۔۔۔

کالوفیر قصبے میں سے گذر رہے تھے کہ دیکھا ——— جیسے سارا قصبہ ہی ہاتھوں میں پھول پکڑے ایک جگہ جمع ہو۔ معلوم ہوا۔ آج دو جون ہے۔ ۱۸۷۶ میں بھی یہی دن تھا، دو جون، جب یہاں کا بہت پیارا شاعر خرستو بوتیف قتل کیا گیا تھا۔ اسی دن وہ نظمیں لکھتا، اپنی بیس روزہ بچی کو بوسہ دے کر، اور ہاتھوں میں بندوق پکڑ کر اپنے وطن کی حفاظت کے لیے وداع ہو گیا تھا۔ اور جب قتل ہوا، اس کی عمر ۲۷ سال، ۵ ماہ تھی۔ اس کے ساتھی اس کے ساتھ مل کر لڑتے اور اس کی نظمیں گاتے گاتے مارے گئے۔۔۔۔

میں نے آج رات خرِستو بوتیف کی ایک نظم کا ترجمہ کیا ہے۔۔۔۔

آج شام کو بہت مینہ برستا رہا۔ باہر نہیں جا سکی۔ اس لیے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر بلغاریہ کا ایک مشہور ناول "انڈر دا یوک" پڑھتی رہی۔ حیرت ہوئی کہ ناول کی ہیروئن کا نام رادھا ہے۔ کئی مقام پر رادھکا بھی لکھا ہوا ہے۔ رات کو کھانے پر اپنے مترجم سے ہنس کر کہتی رہی ——— "رادھا بلغاروی کیسے ہو گئی؟ کرشن تو بھارت کا تھا، شاید کرشن سے ملنے کے لیے رادھا بلغاریہ سے ہی گئی ہو۔۔۔"

۳ جون ۱۹۶۶ء

صبح ایک اخبار کے ایڈیٹر نے میری نظم ترجمہ کی۔

چاند سورج دو دواتیں، قلم نے چہچہے ڈبوئی\
حکمرانو! دوستو!\
گولیاں، بندوقیں اور ایٹم چلانے سے پیشتر یہ خط پڑھ لو۔\
سائنس والو دوستو!\
گولیاں، بندوقیں اور ایٹم بنانے سے قبل یہ خط پڑھ لو۔\
ستاروں کے حروف اور کرنوں کی بولی اگر پڑھنی نہیں آئی۔۔\
کسی عاشق ادیب سے پڑھوا لو۔\
اپنی کسی محبوب سے پڑھوا لو۔۔۔۔

آج دوپہر جب غیر ممالک سے ثقافتی تعلقات کے محکمے نے مجھے، دوا ئی دعوت

دی، وہاں کچھ شاعر بھی تھے۔ بلغاریہ کی سب سے مشہور شاعرہ ایلس بیتا باگریانا بھی شعلہ گلبے بھی، اور سبھی دوستی کے جام پیش کرتے رہے۔ ڈورا گابے نے عورت شاعر ہونے کے ناطے، ایک عورت وزیراعظم پر فخر کرتے ہوئے اندرا گاندھی کے نام ٹوسٹ پیش کیا، اور میں نے مور کے پروں کے پنکھے تحفہ دیتے ہوئے امن کے نام پر! کہا۔ یہ رنگین پر ہمارے ملک کے قومی پرندے، مور کے پر ہیں۔ ہم ساری دنیا میں امن چاہتے ہیں ___ تاکہ ہمارا قومی پرندہ دنیا کے صحن میں کلولیں کر سکے۔ ۔ ۔ ۔

۱۴ر جون سنہ ۱۹۶۶ء

جیسے ہی شام ہوتی ہے، ماسکو یونیورسٹی پریوں کے محل کی طرح جھلملانے لگتی ہے۔ ایک بلین سامنے کھڑے ہونے اور اس بلند مقام سے نیچے بہتے ماسکو دریا کی طرف دیکھتے ہوئے، دریا کی باہنوں میں مصور شہر کی جگمگاہٹ دکھائی دیتی ہے، ایک حسین حقیقت! جنگ کے خونیں دریاؤں کو تیر کر اور بھوک کے ریگستانوں کو چیر کر لائی ہوئی حقیقت!

۲۵ ستمبر، جارجیا میں، اس کے ایک پیارے شاعر شوطا رستاویلی کا آٹھ صد سالہ جشن شروع ہو رہا ہے۔ وقت کی حکومت میں جب اس کو جلاوطن کیا تھا، اس کو کیا معلوم تھا کہ وقت کے سمندر میں مل مل کر نہا کر اس کی کہانی ایک جل پری کی طرح نکل آئے گی۔ ۔ ۔ اس زمانہ میں ملک میں اس کا نام لینا بھی جرم بن گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کی تحریروں کو زبانی یاد کر لیا تھا۔ آج جارجیا کے ان دو بندوں کو اعزاز سے نوازا گیا ہے جن کو رستاویلی کا سارا کلام زبانی یاد ہے۔ ۔ ۔ ۔

طبلسی کی ایک اونچی پہاڑی پر حسین عورت کا بت بنا ہوا ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے، ایک ہاتھ میں انگوروں کے رس کا پیالہ۔ تلوار دشمنوں کے لیے، اور انگوروں کا رس ملک کے بہی خواہوں کی نذر۔ ۔ ۔

آج میٹیخی چرچ دیکھا جو چھ صدیاں تو چرچ رہا تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں حملہ آوروں کے ہاتھوں قید خانہ بن گیا تھا۔ میکسم گورکی نے بھی یہاں قید کاٹی تھی۔ ۔ ۔ ۔

طبلسی سے ۱۶۲ کلومیٹر دور بارجومی دیلی کی طرف جاتے راہ میں گوری قصبہ بھی آیا، جہاں اسٹالن کا پیدائشی گھر دیکھا۔ ۔ ۔ دنیا کے ہر ملک سے ادیب آئے ہوئے ہیں۔ بارجومی

کی شام ادیبوں کی ملاقات کے حوالے ہے ۔ ہر ملک کے ادیب نے بہتر زندگی کی امید میں کچھ لفظ کہے، لیکن جب ویت نام کا شاعر چے لن دن کھڑا ہوا تو سب کا دل بھر آیا۔ آج اس کے لفظ میں ——— ہماری نظم خون کے دریا عبور کر رہی ہے، آج یہ صرف ہتھیاروں کی بات کرتی ہے تاکہ کبھی یہ گلوں کی بات چھیڑ سکے ۔ ہمارے سپاہی جب میدان جنگ میں جاتے ہیں، لوگ نظمیں لکھ کر ان کی جیبوں میں ڈال دیتے ہیں ۔ ہم ان جیبوں کی خیر مانگتے ہیں جن میں نظمیں پڑی ہوئی ہیں۔ آج اگر ہم نے نظم بچالی تو سمجھنے، انسان بچا لیا . . . .

اور ابھی، میری آنکھیں بھر آئی ہیں، ویت نام کے اس شاعر نے میرے پاس آکر کہا ——— "تم ہندوستان سے آئی ہونا؟ تمہارا نام امرتا ہے"! میں متعجب ہوئی تو اس نے بتایا ——— ویت نام سے آتی بار ہمارے مشہور شاعر سُوَن خیاؤ نے مجھے کہا تھا کہ اگر کوئی عورت ہندوستان سے آئی ہو گی تو اس کا نام امرتا ہوگا ۔ اس کو میری یاد دینا . . . . ."

دل سے ایک دعا اٹھ رہی ہے ——— کاش! ساری دنیا کی خوبصورت نظمیں مل جائیں اور وہ ویت نام کی حفاظت کر سکیں . . . .

۲۷ ستمبر ۱۹۶۶ء

آج آرمینیا کے دارالخلافہ یرے وان میں اس کے قدیم مسوّدوں کا سنبھال گھر دیکھا۔ یہ لوگ ہمیشہ دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلتے رہے ۔ یہاں تامل زبان میں لکھے ہوئے ان کی تاریخ کے وہ صفحات بھی حفاظت سے رکھے ہیں جو کبھی انہوں نے جنوبی ہندوستان میں بسنے کے زمانہ میں لکھے تھے . . . . آج تیرھویں صدی کا ایک وہ چرچ دیکھ رہی تھی جو ایک پہاڑ کو چوٹی کی طرف سے کاٹ تراش کر بنایا ہوا ہے، تب دیکھا ——— اس نیچے چبوترے سے ایک چھوٹی سی سیڑھی پتھروں کی ایک غار میں جاتی ہے۔ غار سے ایک موہ آ گیا۔ جھجک کر کسی سے پوچھا، میں اس کے اندر جا سکتی ہوں؟ وہ جگہ جیسے مجھے زبردستی اپنی طرف کھینچ رہی تھی، لیکن خود ہی میں نے ہچکچا کر کہا ” شائد نہیں ——— “ کیونکہ دیکھا، لوگ اس چبوترے کو ہونٹوں سے چوم رہے تھے ۔ اس لیے سوچا ——— اس پر پاؤں رکھ کر شائد آگے نہیں جایا جا سکتا ۔ لیکن مجھے جواب ملا ——— ”اس غار میں ایک طاق ہے جہاں چراغ جلا کر ہمارے ادیب، حملہ آوروں سے چھپ کر، وقت کی تواریخ لکھتے تھے ۔ تم اس چبوترے سے گذر کر جتنی دیر چاہو، غار میں رہ سکتی ہو ۔ “

طبلسی میں برطانیہ کے ایک ادیب نے مجھ سے پوچھا تھا "تمہیں کبھی کسی خاص ملک کے لوگوں سے خاص محبت، اشتراک کا احساس ہوا ہے؟" تو میں نے جواب دیا تھا — "اس طرح کسی ملک میں کبھی محسوس نہیں ہوا، لیکن کئی کتابوں کے کئی کرداروں کے ساتھ ضرور محسوس ہونے لگتا ہے . . . . ." لیکن آج ریوان کے ایک چرچ کے ایک غار نے میرے اندر اچانک اس طرح موہ جگادیا ہے تو سوچ رہی ہوں، صرف کتابوں کے کردار ہی نہیں، کوئی گوشے، کونے بھی اس قسم کے ہوتے ہیں جو اجنبی ملکوں میں کچھ اپنے محسوس ہونے لگ جاتے ہیں . . . .

۲۔ اکتوبر، ۱۹۶۶ء

ماسکو سے کوئی دو سو کلومیٹر لمبا راستہ پیڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سنا ہوا تھا کہ روس کے جنگلوں میں موسم خزاں دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ آج دیکھ رہی ہوں — درختوں کے پتّے سونے کے چوڑے پتوں کی طرح جھولتے لگتے ہیں۔ کئی پیڑوں کے تنے سر بسر سپید ہیں جیسے چاندی کے پیڑوں پر سونے کے پتّے اُگے ہوں . . . .

یاسنایا پولیانا میں آج ٹالسٹائے کے گھر کھڑی تھی، اس کمرے میں، جہاں اس نے "جنگ اور امن . . . ." لکھی تھی۔ اس کی خوابگاہ کے پلنگ کے پاس ٹالسٹائے کی ایک سپید قمیض ٹنگی ہوئی ہے۔ پلنگ کے بازو پر میں ایک ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی کہ دائیں جانب کی کھڑکی میں سے ہلکی سی ہوا داخل ہوئی اور اس ٹنگی ہوئی قمیض کا بازو ہل کر میری بانہہ سے چھو گیا . . . . ایک پل کے لیے جیسے وقت کی سوئیاں پیچھے مڑ پڑیں۔ — ۱۹۶۶ سے ۱۹۱۰ پر آگئیں۔ اور میں نے دیکھا — گلے میں کھلی سپید قمیض ڈالے، وہاں دیوار کے پاس ٹالسٹائی کھڑا ہے . . . . پھر خون کی حرکت نے معمول پر آ کر دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا، اور بائیں ہاتھ کی دیوار پر صرف ایک سپید قمیض لٹک رہی تھی . . . .

۸، اکتوبر ۱۹۶۶ء

"پوئٹری از اے کنٹری وداؤٹ فرنٹیئرز" کہتے ہوئے، یوگوسلاویہ والے ہر سال اگست کے آخر میں آخرد جھیل سے دس کوس کے فاصلہ پر سٹرگا شہر میں دریا سے درم کے کنارے شاعری کا میلہ لگاتے ہیں۔ پہلے روز صرف میسوڈینین زبان کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں، اور دوسرا رات ساری یوگوسلاویہ زبانوں اور مہمان زبانوں کے شاعروں

کے لیے ہوتی ہے۔ سارے شاعر دریا کے پل پر کھڑے ہو کر نظمیں پڑھتے ہیں اور سننے والے دریا کے دونوں کناروں پر بیٹھ کر سنتے ہیں، کئی کشتیوں میں بیٹھ کر بھی جلتی مشعلوں اور بجلی کے قمقموں کی روشنی دریا میں جھلملاتی ہے تو یہ رات کسی پری کہانی ایسی بن جاتی ہے۔ شاعر اپنی اپنی زبان میں نظمیں پڑھتے ہیں، اور ان کے تراجم یہاں کے مشہور اداکار پڑھتے ہیں جس ملک کا شاعر جس وقت نظم پڑھتا ہے، تو اس ملک کا پرچم لہرایا جاتا ہے۔ آج یہاں نظم پڑھنا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے..... یہ سب تالیاں ہندوستان کے نام پر ہیں ——— کالیداس کے ملک کے لیے، ٹیگور کے ملک کے لیے، نہرو کے ملک کے لیے.....

۲۶ اگست ۱۹۶۷ء

کل آخرد سے سکوپیا پہنچنے کے لیے جس کار کا انتظام تھا، اس میں ایتھوپیا کا ایک شاعر صبرا جنبری بھی تھا اور ایتھوپیا کا شہزادہ مختیا سیلاسی (MAHTEME SELASSIE) بھی ہم راستے میں زیادہ ترسترُوگا میں ہوئے شاعری کے میلے کی باتیں کرتے رہے، لیکن ایک جگہ ٹھہر کر بیئر کا ایک ایک گلاس پیتے ہوئے ایتھوپیا کے پرنس کا دل چھلک پڑا ———

”آپ شاعر لوگ خوش نصیب ہیں..... حقیقت کی دنیا نہیں آباد ہوتی تو تخیل کی دنیا آباد کر لیتے ہیں..... میں بیس سال وائلن بجاتا رہا تھا۔ ساز کی تاروں سے مجھے عشق ہے۔ لیکن جنگ کے دنوں میں میرے دائیں بازو میں گولی لگ گئی، اب میں وائلن نہیں بجا سکتا..... موسیقی میرے سینے میں منجمد ہو گئی ہے..... تواریخ خاموش ہے۔ میں بھی کل سے خاموش ہوں ——— موسیقی کے عاشق ہاتھوں کو گولیاں کیوں لگتی ہیں، اس کا جواب کسی کے پاس نہیں..... اس سوال کے سامنے صرف خاموشی کی بندگی ہے.....“

۲۹ اگست ۱۹۶۷ء

بلگریڈ سے قریب سو میل دور، اگرنواچ شہر کے پہلو میں کھڑا ہونے پر دور تک ایک سرسبز خلاء دکھائی دیتی ہے۔ اس خلا میں دو سپید پر دکھائی دیتے ہیں، قریب اٹھارہ گز لمبے اور زمین سے قریب دس گز بلند۔ اس وقت ۱۹۴۱ تھا، اکتوبر ماہ کی ۲۱ تاریخ، جب ایک سکول میں قریب تین سو بچے اپنا سبق پڑھ رہے تھے کہ جرمن فوجوں نے سکول کو گھیر ڈال دیا، ایک ایک بچے کو، سمیت استادوں کے، گولیوں سے بھون ڈالا..... یہ پتھر کے پر اس مرتی ہوئی پرواز کے نشان ہیں جو ان تین سو بچوں کی چھاتی میں بھری ہوئی تھی.....

اس دن پورے شہر کی آبادی قتل ہوئی تھی ـــــ سات ہزار لوگ ـــــ آج پتھر کے دو بت، ایک مرد کا اور ایک عورت کا، ان سات ہزار مزاروں کا نشان ہیں ..... یہاں کھڑے ہو کر آج جو کچھ ایک زندہ انسان کے سینے میں ہوتا ہے، وہ یا تو یہ ہے کہ اس کے زندہ سینے میں سے نکل کر گوشت کا ایک ٹکڑا ان بتوں میں سما گیا ہے، اور یا پھر ان بتوں میں سے نکل کر پتھر کا ایک ٹکڑا ہمیشہ کے لیے اس کے سینے میں اتر گیا ہے....

۳۱۔ اگست ۱۹۶۷ء

ہنگیرین شاعر وہار بیلا نے ملتے ہی کہا ـــــ "کوئی بھی حملہ آور جب زمین کے کسی قطعے پر پاؤں رکھتا ہے تو سب سے پہلے وہاں کی کتابوں کی الماریاں لرزتی ہیں۔ لیکن جب کوئی شاعر کسی دور سرزمین کے ٹکڑے پر پاؤں رکھتا ہے تو کتابوں کی الماریاں اور بڑی ہو جاتی ہیں ـــــ" خوش آمدید کے ان پیارے لفظوں کے بعد آج وہ مشین دیکھی جس پر ۱۵ مارچ ۱۸۴۸ء کو شان ڈور پیتوفی کی لکھی ہوئی وہ باغی نظم چھپی تھی جو اب وہاں کا قومی گیت ہے۔

آج یو باج کارو لئے کی ملاقات بھی بڑی یادگاری ہے۔ سٹالن کی موت تک اس شاعر کی کوئی کتاب نہیں چھپ سکی، یہ چار سال سائبیریا میں جنگی قیدی رہا۔ ۱۹۴۸ء میں رہائی کے وقت اس کی جیبوں کی تلاشی لی گئی تو جیبوں سے نکلی نظموں کی وجہ سے اس کو ایک سال کے لیے پھر جیل میں ڈال دیا گیا.....

آج بڈاپسٹ ریڈیو سے بولنے کے لیے، اور ہنگیرین ادیبوں کی مجلس میں پڑھنے کے لیے جب میں نے اپنی نظمیں منتخب کیں، تو خوش ہوں کہ مجھ سے کوئی سوشلسٹ لحاظ داری کی مانگ نہیں کی گئی۔ وہی نظمیں چنی گئیں جنہیں میں چاہتی تھی۔ آج شان ڈور راکوش نے میری نظموں کا ترجمہ کیا ہے.....

رائٹرز یونین کے دفتر میں یہاں کے مشہور شاعر گابور گورائی سے ملتے وقت فرانس کے اس شاعر سے اچانک ملاقات ہو گئی جو گذشتہ سال جارجیا میں ملا تھا اور اس نے میری ڈائری میں لکھا تھا ـــــ "اگر کبھی میں آئندہ برس تم کو پیرس میں مل سکوں....." لیکن آج اس نے پہلی بار میری نظمیں پڑھیں تو خوشی سے بول اٹھا ـــــ "خدا کا شکر ہے کہ یہ نظمیں نظمیں ہیں۔ مجھے خوف تھا کہ تم صرف سوشلسٹ نظمیں لکھتی ہو گی....." اور اس بات پر صرف میں

نہیں، میرے ساتھ بیٹھے ہنگیرین شاعر بھی کھل کر ہنستے رہے۔۔۔۔
ایک شاعرہ کہہ رہی ہے ——— "پورے دس برس ہم کو خاموشی کی ایک لمبی گفا میں سے گذرنا پڑا۔ اب تسلیم شدہ میعاروں سے الگ ہو کر لکھی نظموں کا چھپنا ممکن ہو گیا ہے۔۔۔۔۔"

آج بڈاپسٹ سے ۱۲۰ کلومیٹر جنوب میں بالاتون جھیل کا وہ کنارہ دیکھا جہاں ۶ نومبر ۱۹۲۶ کو رابندر ناتھ ٹیگور نے آکر ایک پیڑ لگایا تھا اور ایک نظم لکھی تھی ۔

میں جب اس زمین پر نہیں ہوؤں گا،
اس وقت بھی میرا یہ پیڑ تمہاری بہار کو نئے پتے دے گا۔۔۔
اور راہ چلتے سیاحوں کو کہے گا ۔
کہ ایک شاعر نے اس سرزمیں کو پیار کیا تھا۔۔۔

پیڑ کے پاس ٹیگور کا بت ہے، اور بت کے قریب ایک سپید پتھر پر یہ سطریں کندہ کی ہوئی ہیں اور اس پر تاریخ پڑی ہوئی ہے ——— ۸ نومبر ۱۹۲۶ء

پیڑ کی شاخ سے ایک پتہ توڑ کر دیکھتی ہوں۔ لگتا ہے، اس کی ڈنڈی پہ آج کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء

جس شاعر کے نام پر اب ہنگری کا سب سے بڑا پرائز ہے، آتیلا یوزیف پرائز۔ اس کی نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے میں اس ریلوے لائن پر گئی جہاں اس نے آج سے تیس برس پہلے خودکشی کی تھی۔۔۔ وہ اس دور میں پیدا ہوا۔ جب شخصی آزادی کے گناہ کے لیے کوئی معافی نہیں تھی۔۔۔ آتیلا کی نظمیں بہت پیاری ہیں ۔ بہ یک وقت ان میں زور بھی ہے اور نزاکت بھی ۔ اس کے آخری دنوں کی ایک نظم کی دو سطریں ہیں ——— "دودھ کے دانتوں کے ساتھ تم نے چٹانوں کو توڑنا چاہا ! نادان! کیا خواب دیکھنے کے لیے کوئی رات کافی نہیں تھی؟۔۔۔"

۲۲-۹ ستمبر ۱۹۶۶ء

آج رومانیہ میں وہ گرجا دیکھا جہاں روسی شاعر پشکن کو محبت کرنے والی ایک یونانی لڑکی کالپسو کی کھوپڑی پڑی ہوئی ہے ۔ رومانیہ کے ایک علاقے میں یونانیوں کی بستی ہوا کرتی تھی، اور جب ۱۸۲۲ میں یہاں ترکی حاکموں کے خلاف بغاوت ہوئی تھی ۔ وہ لڑکی بھی

ان باغیوں میں شامل تھی ۔ اور جب ان لوگوں نے روس کے جنوبی علاقے میں پناہ لی تو اس کا پشکن سے میل ہوا ۔ لیکن کاپسو ایک دہ نظم تھی، جس کے لیے پشکن کے پاس کاغذ نہیں تھا ۔ اور وہ مایوس ہو کر واپس چلی آئی ۔ گرجے میں عورت کو رہنے کی ممانعت تھی، اس لیے وہ مرد سادھو کے بھیس میں گرجے کے اندر رہنے لگی ۔۔۔ کہتے ہیں ــــــــ یہ صرف اس کی موت پر پتہ چلا کہ وہ عورت تھی . . . . . ۱۸۴۰ میں اس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے وقت ایک خط لکھا، اور سرہانے کے پاس رکھ دیا . . . . میں گرجے کی گُفا کے اندر کھڑی ہوں، کانوں میں ایک کھڑک سی پڑتی ہے ۔ پتہ نہیں، باہر خزاں کی تیز ہوا سے ارسپکار پیڑوں کے پتوں کی یہ کھڑکھڑاہٹ ہے کہ وقت کی آغوش میں پڑا ہوا کاپسو کا خط ہل رہا ہے . . . . .

۹ ۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء

آج اپنی محنت کرنے کی عادت میرے کام آئی ۔ جس ملک میں جاتی ہوں، وہاں کی کم سے کم دس عمدہ نظموں اور کچھ کہانیوں کا ترجمہ ضرور کرتی ہوں ۔ اس لیے ان ملکوں کے ادیبوں کے بارہ میں مجھے کچھ واقفیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ کل رومانیہ سے بلغاریہ پہنچی، تو پتہ لگا کہ آجکل ہماری وزیرِ اعظم بلغاریہ آئی ہوئی ہیں ۔ آج ان کی طرف سے ملک کے صدر کو چائے کی دعوت تھی ۔ وہاں اندرا جی نے علیحدہ کمرے میں بلا کر جب میرا صدر سے تعارف کروایا تو بلغاریہ کے ادب کے بارہ میں میں اتنی باتیں کر سکی کہ وہ بھی متعجب تھے ــــــ مجھے ان کے ملک کی اتنی واقفیت کیسے ہے !

۱۵ ۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء

اکیس اکتوبر کو یوگوسلاویہ کے جس شہر کراگوہیواچ میں جرمن فوجوں نے سات ہزار لوگ ایک ہی دن میں ہلاک کیے تھے، اس شہر والوں کا بلاوا تھا کہ اکتوبر میں میں پھر وہاں آؤں اور اس دن اس خوفناک واقعہ کے بارہ میں لکھی ڈی سانکا میکسیمووچ ــــــ ــــــ کی مشہور نظم کا پنجابی ترجمہ پڑھوں ۔ لیکن ملک ملک گھومتے ڈھائی مہینے ہو گئے ہیں، اور اس بلاوے کو کسی اور سال پر ڈال کر میں جرمنی آ گئی ہوں ۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج وہی تاریخ ــــ ۲۱ ۔ اکتوبر ۔ دل میں ایک بے کلی سی جاگی کہ جہاں اتنے لوگ قتل کیے گئے، میں وہاں جانے کی بجائے وہاں آ گئی ہوں جہاں کی فوجوں نے وہ قتل کیے تھے . . . لیکن آج فرینکفرٹ میں یہاں کے مشہور ادیب ہائن رشن بیل کو جرمنی کا گئے اور گ

پوئٹس" ایوارڈ ملنا تھا، اور مجھے اس موقعہ پر مدعو کیا گیا تھا، اس لیے ایئرپورٹ سے سیدھا وہاں چلی گئی ۔ وہاں ہائنرش کی جوابی تقریر سے دل کو چین آیا ۔ وہ کہہ رہا تھا ـــــ "یہاں آپ مجھے انسانی جذبات کی پیروی کرنے کے لیے اعزاز دے رہے ہیں لیکن یہ اعزاز لیتے ہوئے مجھے خوشی نہیں ۔ یہاں سے کچھ دور ویت نام کے اوپر بم گر رہے ہیں ، اور میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا . . . . "

فرینکفرٹ میں گیٹے کا گھر دیکھا اور سٹوٹ گارٹ میں شلر کا . . . . یہاں کے ایک فلاسفر نے کہا تھا ـــــ "جس زبان کے لوگوں نے دنیا میں اتنی ہلاکت پھیلائی ہے ، اس زبان میں اب کوئی نظم یا کہانی نہیں لکھی جا سکتی ـــــ " لیکن سوچ رہی ہوں ـــــ یہ سرزمین فلاسفروں کی ہوتی تھی ۔ اور آج بھی جہاں غم کا یہ احساس ہے ، یہ گہرا شعور ، اس زبان میں کچھ بھی تصنیف کیا جا سکتا ہے . . . .

[illegible] - اکتوبر، ۱۹۶۷ء

آج میونخ میں ہوں ـــــ جہاں ہٹلر کا ٹرائل ہوا تھا ۔ شہر سے بیس میل دور ایک کانسنٹریشن کیمپ دیکھنے گئی تو وہاں ایک جرمن دوشیزہ نے بھری آنکھوں کے ساتھ میری بانہہ پکڑ کر پوچھا ـــــ "تمہارا کیا خیال ہے ، ہمارے لوگوں نے یہ جو کچھ کیا تھا ، کبھی ہم کو اس کا پھل بھگتنا پڑے گا ؟ . . . . " آج یہ وہی ملک ہے جس کے شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگے دیکھ رہی ہوں جن پر لکھا ہوا ہے ـــــ "جو کوئی بھی امریکہ کی ویت نام میں اختیار کی جا رہی پالیسی کا حامی ہے ، وہ قاتلوں میں شمار ہے . . . . "

[illegible] اکتوبر، ۱۹۶۷ء

آج دوسری بار یوگوسلاویہ آنا اور سٹروگا میں اس کے بین الاقوامی مشاعرے میں حصہ لینا ، میری زندگی کا ایک اور بہت یادگاری دن ہے . . . . بہت سارے ادیبوں کے انٹرویو لیے گئے ہیں ۔ اور مجھ سے پوچھے گئے سوالوں میں سے ایک سوال تھا کہ میرے لیے آزادی کے کیا معانی ہیں ؟ جواب دیا ، وہ نظام جو عام معمولی لوگوں کو بھی زندگی کے معنی دے ، لیکن جس میں کسی کی انفرادیت نہ گم ہو . . . . .

آج ایک تاریخی چرچ کو سٹیج بنا کر پابلو نرودا کی نظموں کی شام منائی گئی . . . .

۲۵-۳۰ آگست ۱۹۷۲ء

واپسی پر میسیڈونیا کی راجدھانی سکوپیا میں ایک لوک گیت سنا جس میں بھارت سے واپس آنے اس سکندر کی کرسی کا ذکر ہے جو صندل کی لکڑی سے بنائی گئی۔ ہمارے کہ یہاں یہ گیت یونان سے آیا ہوگا۔ میرے پاس صندل کی لکڑی کی کچھ پنسلیں تھیں جو میں نے یہاں کے ادیبوں کو سوغات کے طور پر دیں۔ تب وہ پوچھنے لگے "کیا آپ کے ملک میں بھی سکندر کے بارہ میں کوئی لوک گیت ہیں؟" جواب دیا "ہمارے ملک میں تو وہ حملہ آور تھا، کیا وہ، کیا ترک، کیا مغل، ہمارے لوک گیتوں میں ان کے بڑے آدر اس ذکر ہیں....."

اس پر یاد آیا کہ سمرقند میں میں نے بھی اسی قسم کی بات وہاں کے لوگوں سے پوچھی تھی کہ آپ کا عزت بیگ جب ہمارے ملک میں آیا، ہماری سوہنی کمہارن سے اس نے عشق کیا۔ تب ہم نے اس کے بارہ میں کئی قصے اور لوک گیت لکھے۔ کیا آپ کے دیس میں بھی کوئی اس کے گیت ہیں؟ ــــ تب وہاں کی ایک پیاری سی خاتون نے جواب دیا تھا ــــ ہمارے ملک میں تو وہ بس ایک امیر سوداگر کا بیٹا تھا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ عاشق تو وہ آپ کے ملک میں جا کر بنا۔ اس لیے گیت آپ نے ہی تو لکھنے تھے، ہم کیسے لکھتے؟

کن ملکوں کے لوگ، کن ملکوں میں جا کر گیتوں کا موضوع بنتے ہیں اور اپنی شخصیت کا کون سا حصہ کہاں چھوڑ آتے ہیں ــــ بڑی دلچسپ تاریخ ہے.... میری کہانیوں میں بھی پنجاب سے باہر کے کئی کردار ہیں جو ملے اور کہانیاں لکھوا گئے۔ جی چاہتا ہے، کسی دن یہ کہانیاں اکٹھی کر کے ان کا ایک مجموعہ تیار کروں....

۳۱-اگست، ۱۹۷۲ء

آج ہم نے نیگردمیں پشکن کی تصویر دیکھی۔ معلوم ہوا، پشکن جب سولہ سال کا تھا، جپسیوں کے ایک ٹولے کے ساتھ مل کر یہاں آیا تھا۔ لیکن زمین کا یہ قطعہ اس کو کچھ ایسا بھایا کہ پانچ برس وہ یہیں رہ گیا۔ یہ تصویر دکھاتے ہوئے وہاں کے ڈائریکٹر نے مجھ سے پوچھا ــــ "پشکن یہاں پانچ سال رہا تھا، امرتا! تم کتنا عرصہ رہو گی؟" ــــ تب میں ہنس پڑی۔ کہا ــــ "صرف بیس دن! میری جیسی اسسٹنٹ صرف بیس دنوں کے لیے ہے...."

یوگوسلاویہ کے شہر پرشتنا نے ہندی نظموں کی شام منائی۔ تھیٹر ہال کے باہر بھی اور اندر بھی بھارت کا نام موٹے حروف میں لکھا۔ کئی بھارتی تصویروں سے دیواروں کو سجایا اور بھارتی موسیقی بجا کر یہ شام شروع کی۔ میری یوگوسلاویہ دوست الیانا چُوگرا نے سرخ ریشم کی ساڑھی زیب تن کی اور سٹیج پر جا کر میرے بارہ میں واقفیت دی۔ ہر نظم میں پہلے اپنی زبان میں پڑھتی تھی، پھر وہاں کے فلم اداکار بارس باری اس کا ترجمہ سربی اور البانوی میں پڑھتے رہے۔

یہاں اتفاق سے ایک امریکی شاعر ہربرٹ کوز بھی تھا جس کو وہ اس شام براہ راست دعوت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن پرشتنا کا ایک رواج ہے کہ اہم مہمان اپنے طور پر کسی مہمان کو بلا سکتا ہے۔ سو میں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر ہربرٹ کوز سے نظم کی گذارش کی۔ جشن کے آخر میں دو چھوٹی بھارتی فلمیں دکھائی گئیں، ایک کھجراہو کے بارہ میں اور دوسری بھارتی زندگی کے کچھ پہلوؤں سے متعلق ——— "آن دی مود! اس شام نے آج میرے دل کو زمین کے پیارے لوگوں کے احساس سے لبریز کر رکھا ہے۔ . . . .

۷ ستمبر، ۱۹۷۲ء

اطالوی سرزمین

یوں تو ہر ملک ایک نظم کی طرح ہوتا ہے ——— جس کے کچھ حروف سنہری رنگ کے ہو جاتے ہیں اور اس کی عظمت و آبرو بن جاتے ہیں۔ کچھ حروف لال سرخ بن جاتے ہیں اس کی اپنی یا بیگانی بندوقوں سے لہولہان ہو کر۔ اور کچھ حروف اس کی ہریاول کی طرح ہمیشہ سرسبز رہتے ہیں ——— جن میں سے اس کے مستقبل کے تاباں پتے روز اُگتے ہیں۔ . . اور یوں ہر ملک ایک ادھوری نظم کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن اطالوی سرزمین کا لمس حاصل ہونے پر یوں محسوس ہوا جیسے ایک نظم کے مکمل یا نامکمل ہونے کے عمل کو بڑا صاف دیکھ رہی ہوؤں اس سرزمین کے چپے چپے پر سنگ مرمر کے بت یوں معلوم ہوتے ہیں گویا اس سرزمین سے بت اُگتے ہوں ——— محسوس ہوا، نظم کے جو الفاظ کانوں میں گر پڑے، وہ سنگِ مرمر بن گئے۔ اور جو لفظ زمین میں بیج کی طرح پڑ گئے، وہ مائیکل انجیلو کے اور دوسرے فن کاروں کے ہاتھ بن کر زمین میں سے اُگ پڑے۔ اور ان دودھ سے سپید حروف کی تاریخ کے

ساتھ ہی سرخ خون رنگ حرفوں کی تاریخ بھی بہت طویل ہے ـــــ جب سپارٹکس جیسے ہزاروں غلام، حاکم رومنوں کی تماشبینی کے لیے ایک دوسرے کی زندگی سے ساتھ کھیلتے تھے ....

اور اس نظم کے حروف زرد بھی ہیں، خوف زدہ، پوپ کے ویٹکین شہر کی اونچی دیواروں کے ساتھ ٹکراتے اور گھبرا سا بن کر آپ ہی اپنے اعضا میں سکڑ جاتے۔ اطالوی سرزمین واقعات وحوادث کی سرزمین ہے ـــــ جہاں کئی حروف اس کے سرسبز جنگلوں کی طرح مستقبل کی شاخیں بھی بن گئے ہیں۔ اور کئی حروف ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے ہیں ـــــ شائد اول مرتبہ اس وقت گم ہوئے جب "ڈیوائن کامیڈی" کا دانتے جلاوطن ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہ بھی جلاوطن ہو گئے تھے .... اور اس نظم کے کچھ حروف وہ بھی ہیں ـــــ جو کسی سیاح سے نہیں پڑھے جا سکتے ـــــ یہ صرف لیونارڈو ڈا ونسی کی مونالیزا کی طرح مسکراتے ہیں .... اسرار سے پُر مسکراہٹ .....

پانچ سو سال کا سفر

آج ایک اور لمحہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے ـــــ ۱۹۶۹ء کے ابتدائی دنوں کی ایک رات تھی، رات کا دوسرا پہر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرے لڑکے کی ٹرنک کال تھی، بڑودہ یونیورسٹی کے ہوسٹل سے۔ میرے فکرمند لفظوں کے جواب میں اس کی آواز تھی ـــــ "میں بالکل ٹھیک ہوں، ماما!" بڑے دنوں کے بعد سنی اس کی آواز میرے کانوں میں سے گزر کر میرے روئیں روئیں میں اتر گئی۔

گرمی ہو یا سردی، میں زیادہ کپڑے پہن کر نہیں سو سکتی۔ محو خواب تھی، جب یہ فون آیا تھا۔ اسی طرح رضائی میں سے نکل کر فون تک آئی تھی ـــــ یوں لگا، جیسے جسم کا گوشت پگھل کر روح میں مل گیا ہو اور میں بیور نیکڈ۔ سول وہاں کھڑی تھی۔ اندھیرے میں جیسے بجلی چمک جاتی ہے، خیال آیا، میں ایک عامیانہ سی ماں، اپنے عامیانہ سے بچے کی آواز سن کر اگر یوں ایک حسین پل جی سکتی ہوں، تب ماتا ترپتا کی کوکھ میں جب گورو نانک ایسا بچہ پل رہا تھا، ماتا ترپتا کو کس طرح کا الٰہی احساس ہوا ہوگا!

یہ سال گورو نانک کے پانچ سو سالہ جشن کا سال تھا۔ مجھے ایک پبلشر کی طرف سے ایک طویل نظم لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ لکھتی تو وہ نظم میرے خون کے ابال میں سے اٹھی ہوئی نہ ہوتی۔ لیکن اب یہ لمحہ، گویا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پانچ سو سال کی تاریکی میں سے گذار کر اس ماں کے پاس لے گیا، جس کی کوکھ میں گورو نانک تھا — ساری تاریکی ایک ہلکی سی لو میں بھیگ گئی۔ روشنی سے گیلا ہو رہا یہ لمحہ، اور پھر معلوم نہیں، کتنے دنوں اور کتنی راتوں میں اس کی مہک بس گئی۔ ان دنوں میں نے ایک یونانی کہاوت کو جیا تھا — آل وڈکین بی میڈ ان ٹوائے کراس — اور نظم لکھی "حاملہ" ماتا ترپتا کے حمل کے نو مہینے جیسے اس کے نو خواب تھے۔ پھر پنجاب کے کچھ اخباروں نے جس طرح برا بھلا کہا، اور اس نظم کو "بین" کر دینے کے لیے پنجاب سرکار پر دباؤ ڈالا، وہ سب سنا۔ اجیت، اخبار میں کسی کرپال سنگھ کسیل کے مضامین نے مجھے "شہوت کی کیڑی" کہہ کر یہاں تک لکھا کہ مقدس گورو نانک پر مجھے نظم لکھنے کا ہی حق نہیں بنتا۔

پنجاب ادب کی بزرگ، آوازیں خاموش تھیں۔ ان کی ذمہ داری شاید خاموشی کے ساتھ تھی۔ لیکن میں اکیلی نہیں کھڑی تھی، ایک حسین لمحہ میرے ساتھ کھڑا تھا۔ ہم دونوں حیرت زدہ تھے لیکن اداس نہیں۔ دیکھا — گورو نانک لفظ کو بہت سے ہاتھوں نے ایک لکڑی کی طرح پکڑا ہوا تھا اور غصہ و غضب سے بازو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ لکڑی مجھے چوٹ پہنچا سکتی تھی، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کر سکتی۔ لیکن اس لمحے نے اپنے حصے کی لکڑی کو تراش کر اس کا کراس بنا لیا تھا۔ اور یہ لمحہ جس کو کراس نصیب ہوا تھا، آج میرے سامنے کرائسٹ کی طرح مسکرا رہا ہے۔ . . . .

ایک دوست کی موت

دوستی نے مرنا تھا، سو مر گئی . . . اور اے دوست!
اب اس کی بڑائی یا برائی، تم کیسے جانو، جو جی میں آتا ہے!
اب اس کا کفن —
ایک میلی دری کا ہو یا زرنگار کپڑے کا، کیا فرق پڑتا ہے!

میں اس کی داستانِ غم سنوں ؟ نہیں، یہ قیامت کا دن نہیں،
کہ اس کی لاش قبر میں سے اٹھ کھڑی ہو۔۔۔۔۔

یہ نظم ۱۹۷۱ء میں مارچ کے آخری ہفتہ میں لکھی تھی۔ ایک دوستی تھی جو ۱۹۶۶ء میں پیدا تھی۔ بالکل ادبی دوستی، ادب میں قدروں و قیمتوں کی، اور جس کی ایک بیٹھک میں "ناگ منی" کی شکل و صورت کے بارہ میں مشورہ ہوا تھا۔ یہ جب ہارٹ فیل، کے سے جھٹکے کے ساتھ ایک ہی پل میں ۱۹۷۰ء کے اواخر میں مر گئی تو اس کی موت کے چار مہینے بعد یہ نظم لکھی تھی۔ یہ نظم گویا اس قبر پر ڈالی جا رہی مٹی کی آخری مٹھی تھی، اور پھر اس دوستی کا ذکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

لیکن آج سچ مچ قیامت کا روز ہے، اور قبروں کی مانند اس کی قبر بھی کھل گئی ہے۔ پیدائش اور موت، ایک یونانی گیت کے مطابق، ایک ہی مونہہ سے کہے ہوئے دو لفظ ہوتے ہیں ——— ہیلو، فیئر ویل! سو ایک ہی وجود کے دونوں لمحے، ایک پیدائش کا اور ایک موت کا، ایک ہی قبر میں دفن تھے، اور آج دونوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ کتنی تعجب انگیز بات ——— یہ لمحے جب پہلے دیکھے تھے، تو پیدائش والا لمحہ کتنا مسرور دکھا تھا اور موت کا لمحہ کتنا اداس، لیکن آج پیدائش والا لمحہ اداس ہے اور موت والا لمحہ مسرور!

"میں نے تم کو مغالطے میں ڈالا تھا، اس لیے اداس ہوں" ایک جیسے کہہ رہا ہے اور دوسرا ابھی سچ کی اس گھڑی کہہ رہا ہے "میں نے تمہارا مغالطہ دور کر دیا ہے، اس لیے سرخرو ہوں، مسرور ہوں" یہ پنجابی کے ایک نئے ابھرتے شاعر کی دوستی تھی۔ سوچتی ہوں، حیرت کسی نہ کسی صورت میں بنی رہتی ہے۔ دل کی مٹی کے اوپر کبھی پانی گر جائے تو یہ مٹی میں سے اٹھتی مہک جیسی بھی ہوتی ہے اور جب سوکھا پڑ جائے، تو مٹی میں سے اڑتی دھول ایسی بھی ہوتی ہے اس وقت تک ——— جب تک انسان پتھر نہ بن جائے۔ میں پتھر نہیں بنی کیونکہ ابھی تک میرے اندر حیرت زدہ ہونے والی حالت باقی ہے۔

اس کو ——— پردیس میں سکالرشپ دلا کر جب بھیجا تھا تو جو چہرہ دیکھا تھا، وہ پھر چار سال کے بعد اس کی واپسی پر نظر نہیں آیا۔ بڑے واقف چہرے کس راستے سے گذر کر بڑے اجنبی بنتے ہیں ——— یوں لگا کہ میں نے اس کے چہرے کے اوپر سے

وہ راستہ دیکھ لیا۔ میرے آخری لفظ تھے، "دوست! میری زندگی میں یہ بڑا تکلیف دہ دن ہے، جیسے میرا اپنا بچہ یا امروز ایسا دوست پردیس سے آیا ہو اور حقیر سی رقم کی خاطر میرے روبرو کذب بیانی کر رہا ہو اور میں ہکا بکا سی رہ گئی ہوؤں . . . . "

ہاں ——— ایک لفظ تھا ——— "ایی" میرا نام،

جب ۱۹۶۷ء میں میں مشرقی یورپ گئی، وہاں وہ ہنگری میں بھی ملا تھا، رومانیہ میں بھی اور پھر بلغاریہ میں بھی۔ ایک شام باتیں کر رہے تھے، میرے اس نام کا ذکر آیا۔ اور اس نے مجھے اس نام سے بلانے کا حق مانگ لیا۔ اس کے بعد وہ یہی نام پکارتا رہا تھا۔ لیکن جس دن وہ اجنبی بن گیا، اس کو یہ نام بھول گیا۔ یہ قدرتی بھی تھا۔ اس لیے اس کے جانے کے بعد زمین پر پڑا ہوا، اپنا یہ نام اٹھا کر میں نے میز کے۔ خانے میں رکھ دیا،

اب ——— آج قیامت کے روز ——— یہی شکر ہے کہ اس دوستی کی پیدائش کا لمحہ اپنے پاک چہرے کے ساتھ اوداس ہے، اور اس کی موت والا لمحہ اوداس نہیں!

پسج کے بیج

۱۹۷۲ء مارچ میں، جب ہندی تنقید نگار، نامور سنگھ کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا، انہوں نے پانچ منٹ کی تقریر میں کہا کہ تنقید کا پیشہ میں نے اس لیے منتخب کیا کہ گھر میں کچھ سجانے سے پہلے اس کی مٹی و گرد صاف کروں۔ یہ تنقید کی عمدہ تشریح ہے، لیکن یکرخی۔ اور میں کتنی دیر سوچتی رہی ——— اس کا دوسرا رخ جس نے پل پل دیکھا اور بھگتا ہے، کوئی ان سے اس کی تشریح دریافت کرے۔ اگر ادب ایک گھر ہے اور اس کی گرد اور مٹی جھاڑنا ——— تنقید، تو کیا اپنے اندر کی گرد دوسروں کے در پر ڈالنے کا رجحان یا جھاڑ پونچھ کے پردے میں چیزوں کی توڑ پھوڑ کو بھی تنقید کا نام دیں گے؟

کلونت سنگھ ورک زندگی میں بہت کم ملا ہے، صرف کچھ بار۔ ادبی حلقے کے مسائل کو کبھی اس نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، کم از کم میرے سامنے۔ لیکن جون ۱۹۷۲ء میں ایک بار، قریب دو سال بعد، وہ اچانک ایک شام آیا۔

پتھر کے کوئلوں کا دھواں، یوں تو برسوں سے، ادبی ماحول کی ہوا میں تھا، لیکن ملک کی

آزادی کے ساتھ جوں جوں ذکر کے مواقع بڑھے ۔ ناموں کو سنایا جانے لگا ۔ توں توں مرغ
بازنے کی کھینچا تانی میں، یہ پتھر کے کوئلوں کا دھواں بہت گاڑھا ہوتا گیا ۔ اور پھر اس میں سے
تصانیف کی سرخ لہک نکلنے کے بجائے عداوتوں کی چنگاریاں اڑنے لگیں ....
کورس کی کتابیں بھی جن کے اختیار میں تھیں ـــــ تبدیل کی جانے لگیں ۔ اور کئی ایک صفحات
کی ثناخوانی سے پُر کیے جانے لگے اور دوسروں کی برائی سے سیاہ ہونے لگے ....

درک نے اداس چہرے کے ساتھ اس کی بات چھیڑی "لیکن یوں دنیا کی کسی
زبان میں نہیں ہوتا، یہ صرف پنجابی میں ....

سوچ رہی تھی، جس طرح ماں باپ کا انتخاب اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا، اسی طرح
بولی کا! اگر یہ کچھ کسی اور زبان میں نہیں ہوتا، اور اگر صرف پنجابی میں ہوتا ہے، تو یہ بھگتنا پڑے گا۔
قلم کا پیشہ جس دن منتخب کیا تھا، اسی روز یہ سب کچھ بھی انتخاب ہو گیا۔ نہ اب بولی کا اور
انتخاب ہو سکتا ہے، نہ اس کے ساتھ جو مضافات لگے ہیں، اس کا ... درک کہہ رہا
تھا "تم نے اچھا لکھا یا برا، کسی کا کیا گنوایا؟" میں ہمیشہ یہی سوچتی تھی ـــــ میری نظموں یا
میری کہانیوں نے اگر کسی کا کچھ نہیں سنوارا، نہ سہی میں نے اس کے لیے کوئی سند کبھی نہیں
چاہی ۔ اگر عمر اور سال گنوائے ہیں تو اپنی عمر کے، لیکن میرے ہم عصر یوں جھاگ چھوڑتے
رہتے ہیں، جیسے ان کی عمریں کھو گئی ہوں .....

درک وہی میرے دل کی باتیں دوہرا رہا تھا۔ میں نے اپنا اور اس کا دل بہلانے کے
لیے اس کو اپنا نیا ناول دکھایا ـــــ "آک دا بوٹا" بتایا کہ اس ناول میں آک کڑوی سچائی
کا مظہر یا تھوہر ہے ۔ بتایا کہ ناول میں کی ایک لڑکی اُرمی کو جب اس کے احباب قتل کر
دیتے ہیں، قتل کا سراغ نہیں ملتا ۔ ناول کا ہیرو، لڑکی کا بھائی، پوچھ پوچھ کر تھک جاتا ہے،
لیکن سب چہروں پر زردی بھری خاموشی چھائی ہوئی ہے ۔ اور دونوں گاؤں، اُرمی کا میکے
کا اور سسرال کا، یوں چپ ہیں ـــــ گویا دونوں کو مرگی کا دورہ پڑا ہو۔ ناول کا ہیرو سوچتا ہے،
مرگی کے مریضوں کو جو نسوار سونگھاتے ہیں، وہ تھوہر کے دودھ سے بنتی ہے ۔ میں دونوں
گاؤں کو کڑوے سچ کی نسوار سونگھاؤں گا ۔

درک ہنستا ہے ـــــ "تم نے تھوہر کے پودے دیکھے ہوں گے، لیکن تم کو معلوم
ہے ـــــ وہ کیسے اگتے ہیں؟"

آپ کو معلوم ہے کہ بیج بوتا کوئی نہیں، لیکن اُگ گئے ہیں .....“

صنوبر کے بیجوں سے جب اُڑتے ہیں، ہر بیج سے میں ایک بیج نہاں ہوتا ہے۔ بیج کے ساتھ پر لگ جاتے ہیں۔ وہ پروں کے سہارے اڑتا جہاں جہاں بھی جاکر گرتا ہے، وہاں وہاں ہی پودا اُگ آتا ہے .....“

کہا ـــــ ”یہ تو بڑی عمدہ بات بتائی، ورک! سچ کی بھی کوئی بجائی نہیں کرتا۔ اس کو قدرتاً ہی پر لگ جاتے ہیں۔ پھر جہاں جہاں بھی اڑکر جاتا ہے، اُگ پڑتا ہے۔ نہیں تو ـــــ زمینوں کے مالکوں نے اس زمین پر کبھی بھی سچ کی کھیتی نہیں کرنا تھی!“

دل کو ایک سکون سا آگیا۔ ورک چلا گیا۔ دوسرے روز ”سوویت لٹریچر“ کا وہ ایڈیشن ڈاک کے ذریعہ آیا ـــــ جو ہند، روس ادب کے بارے ایک خاص نمبر کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ اس میں روسی شاعرہ ریما کازاکووا کا، روسی میں شائع ہوئی میری نظموں کی کتاب کے بارہ میں، مضمون تھا۔ جس میں آخری سطریں تھیں ـــــ ”یہ ایک جرأت ہے کہ کوئی اپنے بڑے قیمتی اور سوز وگداز میں ڈوبے تجربے دوسروں کے ساتھ مشترک کرے اور یوں کئیوں کا دوست اور ساتھی بن جائے۔ دور پنجاب کی اس عورت کو میں یقین دلاتی ہوں کہ یہاں کے ہزاروں ہاتھ، اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔“ میں نے ریما کو کبھی نہیں دیکھا۔ چار بار ماسکو گئی تھی، لیکن اس کے ساتھ ملاقات نہیں تھی ہوئی۔ لیکن آج کی سنسانی میں اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں کے قریب تھے ..... تھوہر کے بیج ـــــ پر لگا کر اڑتے ـــــ پتہ نہیں دنیا میں کہاں کہاں جا پہنچتے ہیں ..... محسوس ہوا، پریوں کے پر صرف لوگ کہانیوں میں دیکھتے تھے، لیکن درد کے بیج جب پر لگا کر اڑتے ہیں ـــــ وہ میں نے زمین پر بھی دیکھ لیے .....

ایک خاموشی

جس قسم کے مشاعرے ہوا کرتے ہیں جانتی ہوں ـــــ میری نظم ان کی ”رونق“ نہیں اس لیے ان میں کبھی بھی میری دلچسپی نہیں رہی۔ پٹیالہ کے پروفیسر پریتم سنگھ جی جن دنوں لدھیانہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل لگے ہوئے تھے ـــــ انہوں نے سکول بورڈ میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کورس کی کتابوں کی ترتیب و تالیف جن سے کروائی جاتی ہے

وہ ہمیشہ غیر ادیب ہوتے ہیں ۔ اور کتابوں سے کوئی مالی فائدہ مصنفین کو حاصل ہونے کے بجائے، ان کو ملتا ہے جو صرف ترتیب و تالیف کرتے ہیں ۔ اس سال ان کی یہ آواز سنی گئی ـــــ گو تالیف کے لیے جتنی رقم انہوں نے تجویز کی تھی، اس سے نصف سے بھی کم منظور ہوئی (پانچ ہزار کے بجائے دو ہزار) ـــــ لیکن اس سال کچھ مصنفین سے ترتیب و تالیف کا کام لیا گیا ـــــ اور ان کی اس بات کی قدر کے طور پر جب انہوں نے مجھے کالج جوبلی کے موقعہ پر لدھیانہ بلایا تو ان کو انکار نہیں تھی کر سکتی ۔ گئی ۔ واپسی کی عجلت تھی، اس لیے اگلی صبح کے ہوائی جہاز میں واپس لوٹنا تھا ۔ پروفیسر پریتم سنگھ جی ہوائی اڈے تک چھوڑنے آئے تھے ۔ وہاں جب جہاز آیا تو پتہ لگا کر یہ جہاز صرف سواریوں کے لیے نہیں ہوتا، یہ اصل میں لدھیانہ کی لوئی کا مال ڈھوتے کے لیے ہوتا ہے ۔ سارا جہاز گانٹھوں سے بھرا ہوتا ہے، صرف گنتی کی کچھ سواریاں ہی اس میں بیٹھتی ہیں ۔ پروفیسر پریتم سنگھ جی ہنس پڑے ـــــ "آج تم کو گانٹھوں کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا ـــــ" اس وقت بے ساختہ ہی میں نے جواب دیا تھا ـــــ "ساری عمر گانٹھوں کے ساتھ ہی تو چلتی رہی ہوں، انسان تھے ہی کہاں ؟"

کسی وقت کتنے سادہ سے لفظوں میں کتنی عظیم حقیقتیں سموئی جاتی ہیں ـــــ وہ لفظ مجھ کو کئی بار یاد آتے رہے ـــ ۱۹۷۲ کی اس سرکاری میٹنگ میں بھی ـــــ جو ملک کے پچیس سالہ جشن آزادی کی تیاری کے سلسلے میں بلائی گئی تھی ۔ دو گھنٹوں کی اس بحث کے بعد کہ مشاعرے اور کوی دربار کس طرح کیے جائیں میں نے صرف کچھ منٹ لیے تھے اور کہا تھا ـــــ نظمیں، ڈرامے، موسیقی، جو چاہے سوچئے، لیکن کچھ ایک بنیادی باتوں کو مدنظر رکھ کر ۔ ایک یہ، کہ پچیس سالوں میں جو کچھ کیا ہے اور جو کر سکتے تھے، اس کی خود کی تنقید سامنے رکھیں، ایک آئینہ مقابل رکھ کر ۔ دوسرا، عام لوگوں کی زندگی میں کچھ عملی تبدیلیاں لانے والی باتیں کر کے ۔ اور تیسرا، ـــــ یہ بات کہہ سکیں کہ ہمارے سیاسی رہنما اپنے اندر کوئی ایسی تبدیلی لائیں ـــــ کہ ان میں لوگوں کا اعتماد بنے " کمرہ شاعروں اور ادیبوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن ایک سکوت چھا گیا ۔ ۔ ۔ سکوت ہی تو چھایا ہوا ہے ـــــ سیاست کو کچھ کہنے سے بیشتر یہ سب کچھ اپنے ادبی حلقوں سے کہنا بنتا ہے ـــــ اس لیے پہلے وہی سامنے آجاتے ہیں ۔

یاد آ رہا ہے ——— ایک ہم عصر نے کہانیوں کی ایک کتاب کسی کورس کے لیے ترتیب دیا تھی، تو مجھے ایک پوسٹ کارڈ لکھا، میری ایک کہانی کی اجازت کے لیے۔ جواب دیا ——— "اجازت بھیج دوں گی، صرف اس قدر بتا چھوڑیے کہ اگر یہ کتاب کہیں کورس میں لگ گئی تو مصنفوں کو کچھ معاوضہ ملے گا؟" ——— تو اس خط کا جواب یہ تھا ——— کہ معاصر صاحب نے میری کہانی ہی کتاب سے نکال دی تھی۔ اور یاد آ رہا ہے ——— ایک بار ایک یونیورسٹی کے لیے کچھ کتابیں پیش ہوئیں۔ بورڈ کی طرف سے منظور ہوئیں تو پتہ چلا کہ ایک کتاب کے ایڈیٹر صاحب نے کسی شاعر سے اس کی تصنیف استعمال کرنے کی اجازت نہیں لی۔ کچھ ایک نے شکایت کی، لیکن ناشر سے تھوڑے تھوڑے پیسے لے کر خاموش ہو گئے۔ میری شکایت ایک اصول کے بارے تھی ——— کہ کسی کی کوئی بھی تصنیف استعمال کرنے سے قبل، اخلاق کا تقاضا ہے، کہ اس سے اجازت حاصل کی جائے۔ سو اس تقاضہ: اخلاق کی بنیاد پر بورڈ سے پھر دریافت کیا گیا کہ اگر امرتا پریتم کی نظمیں اس کتاب میں سے نکال دی جائیں تو کوئی فرق پڑتا ہے؟ ——— بورڈ کا فیصلہ تھا کہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوچتی ہوں ——— اس قسم کے بورڈ میں بھی کچھ کسر ہے۔ یہ کسر اگر کبھی نکل جائے گی ——— تو اس طرح کے بورڈ یہ فیصلہ بھی دے سکیں گے ——— سبھی شاعروں کی نظمیں نکال دو جی، کوئی فرق نہیں پڑنے کا!

سیاہ بادلوں کے سنہری حاشیے

سیاہ بادلوں کے سنہری حاشیے بھی بنتے ہیں ——— کبھی حیران، آسمان کے مونہہ کی طرف دیکھتی رہ جاتی ہوں . . . . ایک دن دل بھر آیا ——— ایک امریکن ناول کا ترجمہ کر رہی تھی، کئی الفاظ اس طرح کے آئے، کسی ڈکشنری میں نہ ملے۔ میری امداد کے لیے یو، ایس، آئی، ایس، کے ہربنس سنگھ جی نے ایک ڈکشنری بھیجی اور اس تحفے کے پہلے صفحے پر لکھ بھیجا ——— "ٹو امرتا پریتم وِد آل دا گڈ ورڈز فرام دِس ڈکشنری!" ——— میرے معاصر ہمیشہ ڈکشنری کے بُرے سے بُرے لفظ انتخاب کر کے میرے لیے استعمال کرتے ہیں ——— لیکن سارے عمدہ لفظ چن کر مجھے دینے کا کسی کو خیال آ گیا . . . . یہ کیسے ہو گیا . . . . بُرے لفظوں کی کانوں کو عادت ڈال لی ہو تو اس طرح کی ایک سطر دیکھ کر بھی کان چندھیا

جانتے ہیں ۔

اسی طرح بنگلہ دیش کی جدوجہد کے ایام میں ایک روز ایک سپاہی کا فون آیا تھا ، "فرنٹ سے ایک روز کے لیے دہلی آیا ہوں ، ملنا چاہتا ہوں!" شام کے وقت وہ ملنے آیا تو ہندوستان میں پناہ لے رہی بنگالی عورتوں کے بارہ میں بتلاتے ہوئے کہنے لگا ___ "زیادہ تر معمر عورتیں ہیں - لیکن کئی جوان بھی - ان کو کشتیوں میں سے ہم لاتے ہیں کیمپوں میں پہنچاتے ہیں ۔ میں نے صرف یہی بات کہنا تھی کہ جس نے آپ کے ناول پڑھے ہوئے ہیں ، وہ غیر عورتوں کے ساتھ احترام کا سلوک کرتا ہے ، ان کو برا ہاتھ نہیں لگاتا ۔" محسوس ہوا ، آج تک جو کچھ لکھا تھا ، ثمر آور ہو گیا ہے ۔ یہ میرے ناول تبصرہ نگاروں کی میزوں تک نہ پہنچیں ، نہ سہی ، یہ اس سے کہیں دور ___ عام سپاہیوں کے دلوں تک پہنچ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

آج یاد آ رہا ہے ___ اس سے پہلی لڑائی کے وقت ، ایک سپاہی نے جنگ پر جاتے وقت اپنی نظموں کا مسودہ میرے نام رجسٹری کروا کر بھیج دیا تھا کہ "اگر میں زندہ رہا ، واپس آکر لے لوں گا ۔ اگر مر گیا تو یہ نظمیں کہیں شائع کر چھوڑئے گا !" ___ میں نے جس کو کبھی دیکھا نہیں تھا ، اس کا کیسا اعتبار جیتا ہوا تھا ___ آنکھیں بھر آئی تھیں ۔ ۔ ۔

جون ۱۹۷۲ء میں نیپال کے ایک ناول نویس دھوسواں سائی نیپال ایمبیسی کے کلچرل کونسلر بن کر دہلی آئے تو ملنے کے لیے آئے ۔ بتانے لگے ___ "میری ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہوا ہے ، ذہن آئی ریڈ امرتا ہم ، مائی اینٹی انڈین فیلنگز آر وینشڈ !" "قلم نے آج توڑا گیتوں کا قافیہ ، یہ عشق میرا پہنچا آج کون سے مقام پر !" وہ بھی ایک مقام تھا ۱۹۶۰ء کا جب یہ نظم لکھی تھی ، اور پھر ___ یہ بھی ایک مقام ہے ، دور بسنے لوگوں کے پیار کا ___ جہاں پہنچ کر حیران بھی ہوں ، اور ان راہوں کی شکرگزار بھی ، جو آخر مجھے اس مقام پر لے آئے ہیں ۔ ۔ ۔

دھوپ کے ٹکڑے

ملک کی تقسیم سے پہلے تک ___ میرے پاس ایک چیز تھی جو سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی ۔ یہ ساحر کی نظم "تاج محل" تھی جو اس نے فریم کروا کر مجھے دی تھی ۔ لیکن ملک

کی تقسیم کے بعد جو کچھ میرے پاس آہستہ آہستہ جمع ہوا ہے ــــ آج اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی ہوں ــــ تو دیے ہوئے خزانے ایسا معلوم ہوا ہے۔

ایک، ٹالسٹائی کی قبر سے لایا ہوا پتہ ہے اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا۔ جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے ــــ "ایشین رائیٹرز کانفرنس" اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا ہوا ہے ــــ "ساحر لدھیانوی" یہ کانفرنس کے موقعہ کا بیج ہے جو کانفرنس میں شامل ہر ادیب کو ملا تھا ــــ اور میں نے اپنے نام کا اپنے کوٹ پر لگایا ہوا تھا اور ساحر نے اپنے نام کا اپنے کوٹ پہ کہ ساحر نے اپنے والا اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرے والا اتار کر اپنے کوٹ پر لگا لیا ــــ اور آج وہ کاغذ کا ٹکڑا، ٹالسٹائی کی قبر سے لائے ہوئے پتے کے ساتھ پڑا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے ــــ گویا یہ بھی میں نے ایک پتے کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنی قبر پر سے توڑا ہو . . . .

قریب ایک دیت نام کی بنی ہوئی ایش ٹرے ہے جو آذربائیجان کے باکو میں وہاں کی شاعرہ مروارد خانم نے مجھے دی تھی، یہ کہہ کر کہ "جب تمہارے الہام کا دھواں تمہارے سگریٹ کے دھوئیں میں آمیز ہو جائے، تو مجھے یاد کرنا"

سالہا سال اس دھوئیں میں چہرے ابھرتے رہے مٹتے رہے۔ صرف دوسروں کے نہیں اپنا بھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا چہرہ بھی ــــ پگھلتا اور لرزتا ــــ اصل میں اسی وقت دیکھا ہے، جب کوئی نظم لکھی ہے۔

یاد ہے ــــ میرے والد کے پاس ایک پیتل کی بڑی خوبصورت ڈبیا ہوتی تھی جس میں ریشمی کپڑے کے ٹکڑوں کی تہہ میں پڑا ہوا ایک بڑا ہی پتلا سا چمڑے کا ٹکڑا تھا ــــ جو انہوں نے ایک اس خاندان سے مانگ کر لیا تھا جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس گورو گوبند سنگھ جی کے پاؤں کی جوتی ہوا کرتی تھی، جو اب ان کے بڑے بزرگوں سے ان کو ملی تھی ــــ صرف چمڑے کا ایک بڑا سا ٹکڑا بھر رہ گئی تھی۔ ایک پتلا سا چھلکا ــــ اسی ٹکڑے کا ٹوٹا ہوا ایک حصہ تھا۔ والد جب بھی اپنی میز کا وہ خانہ کھولا کرتے تھے جس میں وہ پیتل کی ڈبیا ہوتی تھی، تو ادب سے بھر جایا کرتے تھے۔

ــــ پتہ نہیں ــــ کس کے لیے کس چیز کا لمس ادب بن جاتا ہے . . . . اور کب اور کس طرح، یہ نہیں جانتی۔ صرف جانتی ہوں کہ ہاتھ اونچا کر کے اس مقام کو چھوا ہے ــــ

جہاں انسانی حسن الٰہی بنتا ہے ۔

قبر کی بات کہہ رہی تھی، ہر اس پل کی قبر جس میں انسانی حسن کو الٰہی بنتا دیکھنے والی حالت شامل ہے ۔ اس حالت میں اپنی ہوں، ملاقتی نے ـــــ امروز کے خط پڑے ہوئے ہیں . . . . . . اور چار پانچ ساحر کے میرے لیے میرے دونوں بچوں کے خط بھی اس حالت کا حصہ ہیں ۔ اور ـــــ اس قبر کو سجانے والے کئی پھول پتے ہیں ـــــ کچھ ناظرین کے خط ۔ اور کچھ دور دراز کے ادیبوں کی دی ہوئی سوغاتیں ـــــ ازبک شاعرہ زلفیا کی دی ہوئی اطلس، جارجین شاعر ارا کلی آباشی دزے کے بنے ہوئے وائین جار، اور شوطا رستاویلی کی تصویر والی انگوٹھیاں، باکو کے شاعر رسول رضا کا دیا ہوا مصور قالین، اور گورکی کا چوبی بت، بلغاروی ادیبوں باگریانا، ڈورا گابے، سنالکا اور کامبوڈا کی سوغاتیں ـــــ عطر، مفلر، بروچ، انگدار ہار . . . اور ایک بلغاروی ڈراموں کی ہدایت کار ایولیا، کومان سے درشہ میں ملی چاندی کی جھالر کا نصف ٹکڑا، جو اس نے یہ کہہ کر دیا تھا، "آج ماں کا ورثہ بانٹا ہے، اس لیے اب ہم بہنیں ہیں"ـــــ اور بلغاریہ کی بت تراش انطونیا کی بھیجی ہوئی وہ تصویر، جو میرا بت بنا کر، اور اس کی فوٹو کھنچوا کر اس نے مجھے تحفے کے طور پر بھیجی تھی . . . . .

یوں لگ رہا ہے ـــــ دھوپ کے کتنے ہی ٹکڑے میری الماری کے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں . . . . . یوگوسلاویہ کی ناول نگار گروز دانا اولو یچ کا بھیجا ہوا سفید راتوں کا موسیقی ریکارڈ پلیئر پر سنتی ہوں ـــــ تو اس میں وہ جارجین موسیقی بھی شامل ہو جاتی ہے جو ارا کلی باشیدزے کی مجھ پر لکھی نظم کا راگ بناتے ہوئے وہاں کے موسیقار۔ شالوا مشوے لاڈزے نے وہ راگ میرے نام کر دیا تھا . . . . جاپان کے ایک ادیب میری مولو کا بھیجا سویٹر اور چین کے ایک ادیب کا دیا ہوا چینی پنکھا میرے گرمی اور سردی کے موسموں کو کچھ کہتے محسوس ہوتے ہیں . . . . اور ٹیگور کا برنجی بت جو ماسکو میں یوم ٹیگور کے موقعہ پر مجھے ملا تھا، ہوے سے میری ایک اس کتاب کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے ـــــ جس میں فیض نے ایک روز اپنا ایک شعر لکھا تھا ـــــ "آ گئی فصل سکوں، چاک گریباں والو! سل گئے ہیں ہونٹ، کوئی زخم سلے نہ سلے . . . ."

ہونٹوں پر بھی کئی شکرانے ہیں ـــــ ان دور پار کے دوستوں کے لیے جنھوں نے

اپنا وقت خرچ کیا، دل خرچ کیا، اور میری کئی نظمیں اور کہانیاں اپنی اپنی زبان کے لوگوں تک پہنچائیں۔

آئیگور سیر بریاکوف بڑے مہربان دوست ہیں۔ انہوں نے کئی کتابوں میں سے انتخاب کر کے ایک پوری کتاب کی نظمیں روسی میں ترجمہ کیں۔ نیوزی لینڈ کے چارلس برینش نے ہندوستان کے سفر کے کئی دن میری نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے میں خرچ کر دئے۔ یوگوسلاویہ کی الیانا چُورا نے کئی نظموں کا سربی زبان میں ترجمہ کیا، پھر البانوی زبان میں ترجمہ کروا کر پوری کتاب شائع کی اور یوگوسلاویہ میں کئی بار میری نظموں کی ادبی شام منائی۔ اولو یوپ گروز داناں نے کئی کہانیاں، ناول "پنجر" کا مختصر ادر سفری ناول سربی زبان میں اٹھایا۔___ میری موڈو نے جاپانی میں کئی نظمیں ترجمہ کیں۔ جارج گرفتھ نے لندن میں شاعری کی ایک شام مناتے ہوئے میری نظمیں پڑھیں۔ مشیگن کے کارلو کپولو نے اپنے پرچے کا ایک پورا ایڈیشن میری نظموں اور کہانیوں کے حوالے کر دیا۔ پرتیش نندی ایسے مشہور شاعر نے وقت نکال کر میری کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خوشونت سنگھ نے ایک پورا ناول ترجمہ کیا۔ مہندر کل سریشٹھ، سریش کوہلی اور منموہن سنگھ جی نے کئی نظموں کے ترجمے کیے اور کرشنا گورووالا نے پورے تین ناول انگریزی میں تبدیل کیے۔ یہ سارے دھوپ کے ٹکڑے میرے کماؤں پر ہیں....“

میرے اپنے ملک میں بھی دوسری زبانوں والوں نے مجھے بڑی عزت دی ہیں۔ اردو والوں نے میری قریب ۱۵ کتابیں اردو میں شائع کی ہیں، تین کنیڑ زبان والوں نے، دو گجراتی، دو ملیالم، دو مراٹھی والوں نے، اور ہندی والوں نے تو سب شائع کی ہیں۔ بلکہ اقتصادی آزادی مجھے ہندی زبان سے ہی حاصل ہوئی ہے۔ منتخب تحریروں کا ایک بڑا مجموعہ میری اپنی زبان میں نہیں، لیکن ہندی میں ہے۔

ہندی میں ترجمہ شدہ نظموں کے مجموعہ "دھوپ کا ٹکڑا" کے وقت شری سمترا نندن پنت کے لفظ پڑھ کر سچ مچ آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انہوں نے لکھا___ "امرتا پریتم کی نظموں میں گھومنا، دل میں کسک بھرے سوز کا زخم لے کر محبت اور حسن کے دھوپ چھاؤں والے راستہ پر چلنے کے برابر ہے۔ ان نظموں کے ترجمہ سے ہندی میں جذبہ، تخیل اور فن کی امیری آئے گی۔" ڈاکٹر بھگوت شرن اپادھیائے نے بھی ایک طویل مضمون لکھا جو انہوں نے اپنی کتاب

سنیلمن نے سندر جیہ میں بھی شامل کیا۔ اس کی کچھ سطریں ہیں —— "مجبوراً بانند میں آیا۔ ایک نظم پڑھی، پھر دوسری، پھر تیسری، اور پھر تو جیسے دل پر اختیار نہیں رہا۔۔۔ بلا آج پنت جی کے اور بھگوت شرن جی کے یہ مہربان بول دوبارہ پڑھتے ہوئے میرے دل پر میرا اختیار نہیں رہا۔ وہ اس طرح کے وسیع الخیال ادیبوں کے روبرو جھک گیا ہے۔۔۔۔۔

۱۹۶۸-۶۹ء میں مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی کی طرف سے کارلو کپولو نے جب اپنے صحیفہ کا ایک پورا ایڈیشن میری تحریروں پر شائع کیا تھا، اس میں بھی ایک ہندی ادیب ریوتی سرن شرما نے میرے ناولوں پر ایک بڑا مفصل مضمون تحریر کیا تھا ——

''the Search for Feminine Integrity''

کچھ بہت پیارے خط بھی میرے سامنے ایک فائل میں پڑے ہوئے ہیں —— پرنسپل تیجا سنگھ پنجابی زبان کے اولین تنقید نگار تھے، اور اپنی قسم کے آخری۔ ان کا ایک خط ہے، ۲۳ مارچ، ۱۹۵۰ء کا —— "عزیزی امرتا! اخباروں کی بداطواری سے دل نہ ہارنا۔ تم غیر محدود زمانوں کے لیے ہو۔ اگر کوئی ایک زمانہ تمہاری شہرت کو سنبھال نہ سکے تو کچھ پرواہ نہیں!"

بنگال کے شہرہ آفاق ادیب پربودھ کمار سانیال ۱۹۶۰ء میں نیپال میں ملے تھے۔ وہاں پہلی بار انہوں نے میری نظمیں سنیں اور میں نے ان کی سنجیدہ شخصیت کو دیکھا۔ بعد میں دہلی آ کر میں نے ان کا مشہور ناول پڑھا —— "مہان پرستھان کے پتھ پر" جس پر کبھی فلم بھی بنی تھی۔ اور انہوں نے کلکتہ جا کر میرا ناول "پنجر" پڑھا۔ ایک دو خطوں میں اس کا ذکر ہوا۔ لیکن کچھ سال بعد وہ دہلی آئے۔ تو ان کے پاس میرا ایڈریس نہیں تھا۔ کچھ اندازہ سا تھا کہ قطب مینار کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں کوئی کالونی ہے۔ اور اتنے سے اندازہ کو لے کر وہ گھر ڈھونڈنے لگے۔ اور کئی کالونیوں میں گھومتے ہوئے، دوپہر کے قریب انہوں نے گھر ڈھونڈ نکالا۔ گرمیوں کی چالیس دوپہر تھی —— میں ان کو پسینہ پسینہ دیکھ کر حیران ہوئی تو وہ ہنس پڑے —— "میں نے سوچا، آخر تو تمہارا گھر دہلی میں ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہر ایک گھر دیکھنا پڑے گا۔ لیکن گھر تو ڈھونڈ ہی لوں گا۔۔۔" اس طرح کے آنس کے سامنے سچ مچ سر جھک جاتا ہے۔۔۔

ہنوئی سے ویت نام کے مشہور شاعر سوَن ضیاو Xuan Dieu کا ایک خط ہے ۲۰ فروری ۱۹۵۸ء کا۔

"The Spring festival (vietnamese traditional lunar new year)

Selection, Covered with peach blossom wrapper, makes me feel as if Spring has already come to me. Our president Hochi minh is paying soon a visit to your great country, I believe you are one of the friends, who will extend to him a most cordial welcome..."

پونا سے شری ڈی، کے، بڑیکر کا خط ہے، میرے نام نہیں، شری پربھاکر ماچوے کے نام، ۲۹۔ جولائی ۱۹۵۴ء کا لکھا ہوا ——" اوپنچے لفظوں کا موہ ٹال کر پنجر" کی کہانی لکھنا، کسی بھی فنکار کے ضبط کا امتحان تھا۔ بنیادی روح کو ہی سامنے رکھ کر ایک ایک لفظ لکھنے سے یہ طبعی ضبط اس بلند پایہ پارۂ فن میں محسوس ہوتا ہے۔ میں تو خود کو خوش نصیب خیال کرتا ہوں کہ ایسا ناول پڑھنے کو ملا۔ دل میں ایک ہی شدید خواہش ہے —— "پنجر" کی کہانی مراٹھی کے ناظرین کو پڑھنے کو ملے۔ میرے دوست شری نثری جوشی اچھے افسانہ نویس ہیں۔ وہ "پنجر" کا ترجمہ کریں گے تو بنیادی کہانی کا دل جاگتا رہے گا۔۔۔"

۱۹۶۰ء کا سال میرے زندگی کے کیلنڈر میں سے پھٹے ہوئے ورق ایسا تھا جس نے دل و دماغ کی رگوں کو مٹھی میں بھر لیا تھا۔ اور اسی کا اثر تھا کہ ۱۹۶۱ء کے ابتدائی مہینے ایک سائیکی ایٹرسٹ کی، روزانہ دس منٹ کی صحبت میں بتائے تھے۔ ان دنوں میں میرے دل کی ٹوٹی رگوں کو اگر کوئی ہتھیلیوں کے ساتھ تسکین دینا نظر آیا تھا تو وہ پنجاب کے مشہور مصور سوبھا سنگھ جی کا تھا —— "بی بی! آپ کی ۲۲/۲ کی لکھی چٹھی آج ۲۳/۲ کو موصول ہوئی ہے۔ پتہ نہیں، میرے صبر کا امتحان لینے کے لیے، کہیں راستہ میں بیٹھی رہی ہو۔۔۔۔ اچھا جی! "ذہن کے دماغ درست کرنے اور نبھانے والی روح کا دماغ خراب کرنے میں دنیا والے کامیاب ہو گئے؟ دنیا والے تو سر سوجھ بوجھ والی روح کو بدراہ اور دیوانہ کا لقب دیتے ہیں، اور اگر وہ سچ مچ دیوانہ بن کر بدراہ نہ بن جائے، تو اس کے بت بنا کر اس کی مرنے کے بعد پرستش کرتے ہیں

جی چاہتا ہے ، اُڑ کر آپ سے آملوں ۔ لیکن میری مفلسی ، اور یہ کھال لپٹا ہڈیوں کا ڈھانچہ
بل کے آگے جتنے ہوئے مریل بیل کی طرح سرمارتا ہے ۔ لمبا سفر ، راتوں کی بے خوابی ہوا
بن کر ڈرا رہے ہیں ۔ لیکن شاید یہ تنہائی کا معتبر حوصلہ کر ہی لے ۔ لیکن اگر میں نہ ہی آسکا
تو آپ نے ضرور آنا ۔ دھولی دھار کی برفوں کے جھرنے اپنی شاعرہ کا راہ دیکھ رہے
ہیں ..... " آپ کا سارے پیار کے ساتھ ، سوبھا سنگھ ۔

پربھاکر ماچوے ہمیشہ ہی بڑے مہربان دوست رہے ہیں ۔ ان کی کئی خاموش
اور سنجیدہ مہربانیاں یاد آرہی ہیں ۔ جتیندر کمار ہندی کے پہلے ادیب تھے ، میں نے ان کو
دیکھا نہیں تھا ، جب انہوں نے میرا ایک ناول پڑھ کر کسی کو خط لکھتے ہوئے اس کا
بڑے اچھے لفظوں میں ذکر کیا تھا اور اس نے وہ خط مجھے بھیج دیا تھا ۔ آج وہ خط مجھے
مل نہیں رہا ۔ لیکن جتیندر جی تو ہمیشہ ہی بڑے اچھے دوست رہے ہیں ۔ چارلس برش
نیوزی لینڈ کے مشہور شاعر تھے ۔ لینڈ فال کے ایڈیٹر ، ان کا ۹ مارچ ، ۱۹۴۰ کا تحریر کردہ
خط بھی میرے سامنے ہے

"I have read the skeleton (my novel Pinjar) and I want to tell you how deeply moving I found it. You have treated the story with beautiful feeling and fine economy and restraint. It is a work to be proud of."

ساتھ ہی یاد آرہا ہے ، اسی ناول 'پنجر' کے خلاف میرے ایک ہم عصر ادیب
نے بڑی تکلیف کرکے کئی خط اخباروں والوں کو اور ریڈیو والوں کو ارسال کیے تھے اور
ساتھ ہی مانگ کی تھی کہ میرے گیت ریڈیو سے نشر نہ ہوا کریں ۔ فائل میں رکھے کئی
پیارے خط پھر سے پڑھتے ہوئے ، اور جو کچھ سلوک اپنی زبان میں میرے ساتھ روا رکھا جاتا
ہے ، اس کی یاد کرتے ہوئے کئی بار یہی محسوس ہوتا ہے ـــــ جیسے ایک ہی وقت
پر انتہائی سرد اور انتہائی گرم ایک دنیا میں نہا رہی ہوؤں ...

غسلِ آتش

Create an idealized image of your self and try to resemble it --

یہ الفاظ کازان زاکس نے اپنی پہلی ملاقات میں اپنی محبوبہ سے کہتے تھے۔ مجھے یہ کسی نے نہیں کہے۔ لیکن میں نے یہ سنے تھے۔ اپنے لہو میں سے سنے تھے.... اور پھر اپنے ہونٹوں سے بھی اپنے کانوں کو کئی بار کہتی رہی۔ ہر اس بار بھی۔ جب ان پر عمل سے بچھڑ جاتی تھی.... میں یہ نہیں کہتی کہ ان لفظوں کا طلسم میری پکڑ میں آیا ہے —— صرف یہ —— کہ ساری عمر یہ ملے گا۔ دمعاون رہے ہیں۔ ان کا طلسم ہی شائد اسی بات میں ہے کہ اپنی شبیہہ جب بھی اپنے تخیل و بردے سے کچھ مشابہت پکڑنے لگتی ہے —— خیالی وجود —— اور بھی حسین بن کر دور جا کھڑا ہوتا ہے۔ صرف یہ کہہ سکتی ہوں —— کہ ساری عمر اس تک رسائی پانے کے لیے سعی وجہد کرتی رہی ہوں۔

سعی وجہد اپنے آپ میں ایک ڈھارس ہوتی ہے —— اسی نے ایک بار کچھ اس طرح کی ڈھارس دی تھی کہ اٹھارہ سال سے انگزیما کے درد سے پریشان اپنے شوہر سے کہہ سکی تھی۔ "آپ کے دل نے یہ طلاق قبول کر لیا ہے لیکن آپ کے دل نے ابھی لوگوں کی گستاخ آنکھوں اور تلخ زبانوں کے سامنے اس سچ کو قبول نہیں کیا۔ مجھ سے علیحدگی والا حادثہ لوگوں کو دیکھ تو لینے دیجئے —— وہ چار دن تک جھک کر کے جب خاموش ہو جائیں گے، ہم اپنے اندر کی سچائی کو ان کی آنکھوں کی آتش میں سے گذار لیں گے۔ اور اس غسلِ آتشیں کے بعد ہم صحت مند ہو کر نکلیں گے!" ایک پیشین گوئی سی کی، "آپ کا انگزیما دور ہو جائے گا!" —— اور ہم نے علیحدگی کی تاریخ طے کر لی —— آٹھ جنوری! یہ ۱۹۶۳ء ستمبر کی بات تھی چڑھتے برس جنوری کی آٹھ تاریخ، اپنے طے کیے دن ہم علیحدہ ہوئے۔ اور فروری میں ان کا انگزیما قطعاً ٹھیک ہو گیا، اٹھارہ سال کے بعد، اور بنا کسی دوا دارو کے۔ سوچتی ہوں، یہ سچ کا سامنا کرنے کی جرأت تھی، جس نے دل کو اور بدن کو قوت عطا کی۔

کچھ اسی طرح کا حادثہ ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔ امروز کی محبت میں خلوص ضرور تھا تاہم اس میں بہت گہرائی پر کہیں تامل بھی ملا ہوا تھا اور بہت حد تک اس کی اپنی نظروں سے بھی

چھپا ہوا۔ وہ اس ڈبدھا کے لمحوں کو کالا آدمی، کہا کرتا تھا جو کبھی کبھی اس کے روپ میں سے ابھرتا اور پھر اندر ہی کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ یہ شاید میری اور اس کی شعوری کوشش تھی کہ یہ دبدھا اور دو دلی اتنے عمق میں اتر گئی کہ سطح پر پھر اس کا وجود کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہی محسوس ہوا، ہم اس سے سرخرو ہو گئے ہیں۔ لیکن امروز کو بخار آنے لگا۔ ایکس رے بھی لیے، لیکن اس نے ایکس رے میں دکھائی نہیں دیتا دیا۔ بخار کو دوسرا مہینہ لگ گیا —— تو وہ خود ہی ایک روز سطح پر آگئی۔ میں جانتی ہوں، میرے ان دنوں کے آنسو میرے تخلیقی وجود کے حلیہ سے مشابہت نہیں رکھتے، میں اس حلیہ سے بہت کم تر تھی۔ لیکن یہ صاف ظاہر سا ہو گیا تھا کہ جب تک وہ مجھ سے بہت دور نہیں ہو جاتا، اس کا بخار نہ جائے گا۔

ایک دوسرے کی سرزمین کو پانے کے لیے بُعد کے ریگستان میں سے گذرنا ضروری تھا، یہ جاننے کے لیے کہ اندرونی پیاس کتنی تھی اور کس لیے تھی؟ جب دوری کا قدم اٹھا لیا، جیا ہے بہت دشوار، تو امروز کا بخار اتر گیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس بُعد کو ہم نے تین سال دیئے۔ اور عوض میں اس نے ہم کو خود کی پہچان دی۔ اور امروز کو یقین ہو گیا کہ اس دنیا میں اس کو صرف میری ضرورت ہے۔ لیکن دو مہینوں میں بخار اترنے کی کرامات —— صرف اس ہمت میں سے آئی تھی —— کہ آدھا سچ نہیں جینا۔ اٹھایا ہوا قدم اگر پورا سچ نہیں معلوم ہوتا، تو وہ قدم واپس کر لینا چاہیئے۔

یہاں ایک بات یاد آئی ہے —— ایک بار ریوتی سرن شرما ٹیلی ویژن پر میرا انٹرویو لے رہے تھے کہ اچانک انہوں نے سوال کیا —— "امرتا! تمہارے ناولوں کی لڑکیاں سچ کی تلاش میں بنے ہوئے گھر مسمار کر دیتی ہیں۔ کیا یہ سماج کے لیے نقصان دہ نہیں!" —— بےساختہ زبان پر جواب آیا تھا "ریوتی جی! آج تک جتنے گھر ٹوٹتے رہے ہیں، جھوٹ کے ہاتھوں ٹوٹتے رہے ہیں۔ اب کچھ سچ کے ہاتھوں بھی ٹوٹ لینے دیجئے!"

جانتی ہوں —— سچ کی چال سے چلنا کتنا دشوار ہے، لیکن خود کو خود کے قیاس شدہ تصور کے سامنے لانا بھی ایک دائمی جدوجہد ہے —— پیہم کوشش۔ سچ ایک ریلیٹو ٹرم ہے —— کئی بار آج کا سچ، کل کا سچ نہیں رہتا —— لیکن یہاں سچ سے میری مراد اس ایماندار سوچ سے ہے، جو دل اور بدن کے عمل میں یکسانیت پیدا کرتی ہے ——

کسی ساز کی تاروں کی سروں کو ہم آہنگ کرنے کی طرح ۔

امروز

"عمر کے اس کاغذ پر عشق تیز سے انگوٹھا لگایا، کون حساب چکائے گا" اس نظم کا پس منظر تھا کہ ایک دفعہ ایک اردو مشاعرے پر لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ لوگ کچھ منتشر ہوئے تو میں نے ہنس کر ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا، آٹوگراف! ساحر نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر وہ انگوٹھا میری ہتھیلی پر لگا دیا جیسے میری ہتھیلی کے کاغذ پر دستخط کر دئیے۔ اس میرے کاغذ کی کیا عبارت تھی جس کے اوپر اس نے دستخط کیے، یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے۔ یہ عبارت نہ کبھی اس نے پڑھی، نہ زندگی نے، اسی لیے کہہ سکتی ہوں ــــ

ساحر ایک خیال تھا ــــ ہوا میں چمکتا، شائد میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک جادو، لیکن امروز کے ساتھ گزاری زندگی، ابتدائی کچھ سالوں کو چھوڑ کر ایک بیخودی کے عالم تک پہنچ گئی ہے۔ اس عالم کو شائد ابھی یاد آئی ایک روز کی ایک بات میں سے کچھ پکڑا جا سکتا ہے۔ ایک دن کسی آئے مہمان نے، میرا اور امروز کا ہاتھ دیکھا۔ مجھے کہنے لگا ــــ تمہارے ہاتھ پر دولت کی بڑی گہری اور لمبی لکیر ہے تمہیں زندگی میں کبھی دولت کی کمی نہیں آ سکتی۔ لیکن امروز سے کہنے لگا۔ تمہارے پاس دولت کبھی نہیں ٹھہرے گی۔ تمہارے ہاتھ کی لکیر جگہ جگہ ٹوٹتی ہے۔ امروز نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــ "اچھا، پھر ہم دونو ایک ہی لکیر سے گزارا کر لیں گے!"

۱۹۶۴ء میں جب امروز نے حوض خاص رہنے کے لیے پٹیل نگر والا مکان چھوڑا تھا، تو اس روز نوکر کی آخری تنخواہ دے کر اس کے پاس ایک سو اور کچھ روپے بچتے تھے۔ لیکن ان دنوں اس نے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں ملازمت اختیار کر لی ہوئی تھی، بارہ تیرہ سو تنخواہ تھی، اس لیے اس کو کچھ فکر نہ تھی۔ لیکن ایک روز دو تین مہینے کے بعد اس نے لاؤڈ تھنکنگ کی طرح مجھ سے کہا ــــ "میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس دس ہزار روپیہ ہوتا اگر جب جی چاہے، نوکری چھوڑ سکوں اور من مرضی کا کوئی تجربہ کر سکوں۔" گرانی بڑھ رہی تھی، لیکن اس کی کہی بات، میرا جی چاہتا تھا پوری ہو جائے۔ جلد ہی

ایک سبب بھی بنا کہ امروز کو تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپیہ ماہوار کا علیحدہ ملنے لگا۔ سو خرچ کی طرف سے جتنا ضبط و تحمل ہو سکتا تھا، کیا اور امروز کے دس ہزار جمع کرنے کی لگن لگالی۔ قریب سال سوا میں سچ مچ دس ہزار ہو گئے۔ اور امروز نے ایک دن اچانک ملازمت چھوڑ دی۔ الگ کام کا پانچ سو کا الگ آسرا تھا، وہ بھی اس سے اگلے مہینے اچانک بند ہو گیا۔ مجھے تین ماہ کے لیے یورپ جانا تھا، چلی گئی۔ میرے جانے کے بعد امروز نے باٹک کا تجربہ سوچ لیا اور اس کے لیے اپنے بھائی کو جنوب کی طرف بھیج دیا کہ وہاں سے کسی باٹک کے ماہر کاریگر کو تلاش کر کے لے آئے۔ میں یورپ سے واپس لوٹی تو اس نے گرین پارک میں تین سو روپیہ ماہوار پر ایک مکان کرائے پر لیا ہوا تھا جس میں دو کاریگر رہ رہے تھے اور رنگوں کے کڑاہے ابال کر نئے خرید کیے کپڑوں کے تھانوں پر باٹک کا تجربہ کر رہے تھے۔ رنگ موزوں نہیں پکڑ رہے تھے اور دھبوں بھرے کپڑوں کا ڈھیر لگا لگا کر پھینکا جا رہا تھا۔

ان دنوں میں امروز کا مزاج دہلی کے اس موسم ایسا تھا ——— جب ابھی دوپہر کے وقت بدن جھلسا جا رہا ہو اور ابھی شام ڈھلے سردی سے ٹھٹھر رہا ہو ——— کچھ کہنا چاہا لیکن سب الفاظ اکارت تھے۔ اوپر سے اڑھائی سو ماہوار پر ایک درزی آ گیا جو کچھ رنگے کپڑوں کی کتر بیونت کر کے قمیضوں کی صورت میں سِل رہا تھا۔ لیکن قمیضوں کی کمر کا سائز اردو شاعری کی حسینہ کی کمر ایسا تھا۔ . . ان قریباً پانچ سو قمیضوں کا یہ حشر ہوا ——— کہ ان کو رسوں سنبھالنے کے لیے ایک الماری بنوانا پڑی اور ایک بڑا ٹرنک خریدنا پڑا۔ اور پھر ان کو دیکھتے ہی جلدی سے الماری کا کواڑ اور ٹرنک کا ڈھکنا بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ایک روز کی بات یاد آ جائے تو آج بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے ——— ایک روز ایک امریکی خاتون کو ایک قمیض بڑی پسند آئی۔ اس کو دکھ رہا تھا کہ اردو شاعری کی نازنین کی کمر کے لیے سِلی یہ قمیض اس کو پوری نہیں آئے گی، لیکن اس نے پردے کی آڑ میں جا کر کسی طرح وہ قمیض پہن لی۔ لیکن اتارنے لگی تو گلے سے نہ اتر سکے۔ اس نے ہار کر پردے کے پیچھے سے آواز دی ——— پلیز گیٹ می آؤٹ آف دِس شرٹ!

دس ہزار پوری طرح ختم ہو گئے تو امروز نے اپنا اکلوتا پلاٹ بیچ ڈالا۔ ساڑھے چھ ہزار کا بِکا تھا۔ اور ایک سال کے اس تجربے کے دوران میں کتابوں کے اکا دکا ٹائیٹل بنانے

کا کام کر کے اس نے جو بھی کیا تھا، بمع اس کے —— خرچ کا پورا میزان بیس ہزار ہو گیا۔ اور پھر اس کا باٹک سے جی اوب گیا۔ اس تجربے میں سے سلک کی ایک قمیض اور سلک کی ایک ساڑھی، جو امروز نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی، میرے پاس ہے۔ جب بھی یہ قمیض یا ساڑھی پہننے لگتی ہوں، بیس ہزار کی یاد آ جاتی ہے۔ اور کبھی اداس ہونے لگتی ہوں کہ امروز ہنس پڑتا ہے "—— اتنی بیش قیمت ساڑھی تو کسی ملکہ نے بھی نہ اوڑھی ہوگی۔ تم کو خوش ہونا چاہیئے آج تم نے دس ہزار کی ساڑھی پہنی ہوئی ہے ——" سو یہ میری ساڑھی بھی دس ہزار کی ہے اور قمیض بھی دس ہزار کی۔ . . میں واقعی میں امیر ہوں —— یہ امروز کے اس حوصلے کی امیری ہے —— جو بیس ہزار گنوا کر یوں ہنس سکتا ہے۔ اور یہ بیس ہزار بھی وہ، جو اس نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا، نہ بعد میں

امروز کو سمجھنا دشوار نہیں۔ اس میں مسلسل چلی آ رہی ایک لکیر ہے (ہاتھ کی ہتھیلی پر نہیں پیشانی کی سوچ میں) —— اس کے ذہن میں چیزوں کی وہ شکلیں ابھرتی ہیں —— جن کو کاغذ پر، کپڑے پر، یا لکڑی، لوہے میں اتارنا —— اس کے بس کی بات ہے —— صرف بڑے وسیلے اس کے بس میں نہیں۔ اس نے ٹیکسٹائل کے عجیب و غریب ڈیزائن بنائے۔ میں دیکھتی تھی اور کہتی تھی —— یہ اگر سچ مچ کاغذوں سے اتر کر دو دو گز کپڑوں پر آ جائیں، تو سارے ہندوستان کی لڑکیاں پریاں بن جائیں . . . . . یہ ڈیزائن کاغذوں پر بنانے اس کے بس میں تھے، اس نے بنا لیئے، لیکن ان کو پارچات پر اتارنے کے لیے کوئی مِل چاہیئے تھی۔ ہمارے ملک کی غریبی یہ نہیں کہ اس کے پاس ملیں نہیں ہیں، غریبی یہ ہے کہ مِل والوں کے پاس نظر نہیں ہے۔ یہ ڈیزائن دو بار دو مِل مالکوں کو دکھائے تھے لیکن نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ لوگ، آئن رینڈ کے اس فقرے ایسے تھے جو اس قماش کے لوگوں کے لیے اس نے ان کی تقدیر کی طرح طے کیا تھا —— ریجیکٹ ایڈ نیٹس!

اصل میں اسی بے بسی میں سے امروز نے باٹک کا ذریعہ سوچا تھا کہ کچھ ڈیزائن ملوں کی محتاجی سے سرخرو ہو کر کپڑوں کے بدن کو چھو سکیں یہ الگ بات ہے کہ یہ کام جب تک کاریگروں کے ہاتھوں میں تھا، کسی ذکر کے لائق نہ تھا، لیکن جب آخر میں امروز نے اس کا سارا عمل اپنے ہاتھ لے لیا تھا، کچھ چیزیں یوں تیار ہوئی تھیں —— آنکھ نہیں ہٹتی تھی، لیکن اس قسم کی چیزوں کے لیے کچھ جاپانیوں اور کچھ امریکیوں کے سوا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اور ساتھ میں

یہ بھی تھا ـــــ کہ یہ ہنر جب اس چوٹی تک پہنچا تھا تو آگے دو گز کپڑا خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے رہے تھے...... یہ معمولی ذریعہ بھی دست رس سے باہر ہو گیا تو اس تجربے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر ہوتے ہوتے وہ تجربے وجود میں آئے ـــــ جن کے لیے ایک بار میں، سو پچاس روپوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی ہوئی۔ امروز نے گھڑیوں کے ڈائل ڈیزائن کرنے شروع کئے۔ جب چالیس پچاس روپے اکٹھے ہوتے، وہ ایک گھڑی خرید لاتا اور اس کا ڈائل ڈیزائن کرتا۔ آج بھی ہماری ایک الماری ان گھڑیوں سے بھری ہوئی ہے جن کو روز چابی دینا ممکن نہیں ـــــ لیکن کبھی کبھی ـــــ ہم وہ الماری کھولتے ہیں اور ساری گھڑیوں کو چابی دے کر ان کی ٹک ٹک بیتھووَن کی سمفنی کی طرح سنتے ہیں...

گھڑیوں میں ہمیشہ "ایک وقت" ہوتا ہے، لیکن امروز نے "دو وقت" گھڑیوں میں پکڑنا چاہا ہے۔ ایک تو عام وقت جو سوئیاں بتلاتی ہیں، اور دوسرا وہ، جو دنیا کے کچھ شاعر لفظوں میں پکڑتے ہیں۔ اس لیے امروز نے نمبروں والے ڈائل نکال کر، گھڑیوں میں وہ ڈائل ڈالے جن کے اوپر اس نے دنیا کے ان شاعروں کی سطریں درج کیں جن میں کئی شاعروں نے ـــــ لمحے پکڑے ہوئے تھے۔ اس طرح سنبھالی ہوئی گھڑیوں میں سے کسی پر فیض کا شعر ہے، کسی پر بلھے شاہ کا، کسی پر وارث شاہ کا، کسی پر شو کمار کا......

اسی طرح امروز کے کچھ کیلنڈر ڈیزائن ہیں۔ کسی کی شکل چوکور میز ایسی ہے جس پر بارہ خانے اور دن شطرنج کے مہروں کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ کسی کی شکل ایک پیڑ ایسی ہے جس کو تاریخوں اور واروں کے سبز پتے لگے ہوئے ہیں۔ کسی کی شکل ایک ساز ایسی ہے جس کے تاروں کو کسنے والی چابیاں ـــــ سال کے وار اور مہینے ہیں۔ یہ سب کچھ اگر کبھی اپنے ملک اور باہر کے ملکوں میں دکھایا جا سکتا ـــــ ہندوستان کا نام ابھر ہو سکتا تھا۔ لیکن کسی سرکاری مشینری کو چابی دے سکنا نہ میرے بس میں ہے، نہ امروز کے!

جب کوئی کسی کا حال اپناتا ہے، اصل اپنے پن میں اس کا اور دوسرے کا ماضی بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایک کا الگ اور دوسرے کا الگ نہیں رہ جاتا۔ گو وہ آنکھوں سے دیکھا نہیں ہوتا، لیکن وہ بھی اپنے وجود کا حصہ بن جاتا ہے ـــــ اپنے جسم کے کسی پرانے زخم کی مانند۔

امروز کو معلوم ہے ـــ موہن سنگھ جی کے لیے میری قدردوں میں میری محبت شامل نہیں تھی۔ ایک بار جب موہن سنگھ جی کی کتاب "جندرے" کا دہ کور ڈیزائن بنا رہا تھا۔ تو کتاب کی سب سے اہم نظم کے مطابق اس نے ٹائیٹل پر دو تالے بنانا تھے ـــ میرے دو بچے، جو موہن سنگھ کے خیال میں دو پھولوں کے تالے تھے ـــ لیکن امروز نے ٹائیٹل پر تین تالے بنائے۔ کہنے لگا "تیرا سب سے بڑا تالا تو خود بچوں کی ماں تھی جو موہن سنگھ کو دکھائی ہی نہیں دیا۔ اس لیے میں نے نامکمل نظم کو مکمل کرنے کے لیے دو کی بجائے تین تالے بنا دیئے ہیں ـــ" اس وقت امروز نے میرے خیالات اپنی پیشانی میں ڈالے ہوئے تھے۔

اور امروز کو معلوم ہے ـــ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ یہ معلوم ہونا اپنے آپ میں اہم بات نہیں ہے۔ اس سے پرے ـــ جو کچھ بہت اہم اور بڑا ہے، وہ امروز کا میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا ہے۔ امروز جب ساحر کی کتاب "آؤ، کوئی خواب بنیں" کا ٹائیٹل بنا رہا تھا، تو ہاتھ میں کاغذ تھامے کمرے سے باہر آ گیا۔ بیرونی کمرے میں میں اور دیویندر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹائیٹل دکھایا۔ دیویندر تنہا دوست ہے جس سے میں ساحر کی بات کر لیتی تھی۔ اس لیے دیویندر نے کچھ ماضی میں گہرا اتر کر ایک بار ٹائیٹل کی طرف دیکھا، ایک بار میری طرف۔ لیکن مجھ سے اور دیویندر سے کہیں زیادہ امروز نے ماضی کے عمق میں اتر کر کہا ـــ "سالا خواب بُننے کی بات کرتا ہے، بُننے کی نہیں!"

میں ہنس پڑی "سالا جولاہا، ساری عمر خواب بُنتا ہی رہا، کسی کا خواب نہ بنا!"

میں دیویندر، امروز، کتنی دیر ہنستے رہے ـــ سمیت اس درد کے جو اس قسم کے موقعہ پر اس قسم کی ہنسی میں شامل ہوتا ہے۔ کبھی حیران ہو جاتی ہوں ـــ امروز نے مجھے کس طرح کا اپنایا ہے، پر، اس قسم کی ہنسی میں شامل ہوتا ہے۔ کبھی حیران ہو جاتی ہوں ـــ امروز نے مجھے کس طرح کا اپنایا ہے، بمعہ اس سوز کے جو اس کی اپنی مسرتوں کا مخالف ہے! ..... ایکبار ہنس کر کہا تھا "ایو! اگر مجھے ساحر مل جاتا، پھر تم تو نہیں ملنا تھا!" ـــ اور وہ مجھے، مجھ سے بھی آگے اپنا کر کہنے لگا ـــ "میں نے تو ضرور ملنا تھا، چاہے نہیں ـــ ساحر کے گھر نماز پڑھتی کو جا ڈھونڈتا!"

سوچتی ہوں ـــ کیا کوئی خدا اس قسم کے انسان سے کہیں الگ ہوتا ہے ... امروز اگر یہ نہ ہوتا، جو ہے، تو میں اس کے موہنہ کی طرف دیکھ کر یہ شعر کبھی نہیں تھی لکھ سکتی ـــ باپ،

جائی، دوست اور خاوند، کسی لفظ کا کوئی نہیں رشتہ، یوں جب میں نے تم کو دیکھا، سارے حرف نمایاں ہو گئے ۔"

امروز کے پاس میرے کئی خطوط رکھے ہیں، لیکن ان خطوط میں سے، میرے دل کی ترجمانی کرتا مجھے ایک وہ خط ملا ہے، جو میں نے اگست ۱۹۶۷ میں اس کو یوگوسلاویہ سے لکھا تھا، وہ خط ہے ۔

جیتی! خفیفوں کی حد بندی سے گھبرا کر ڈھونڈی ہوئی ایک شے ہوتی ہے 'فنیٹی'! لیکن سوچتی ہوں، جو صبر و سکون کے ساتھ ڈھونڈا ہوتا ہے، وہ اس سے آگے ہوتا ہے۔ اس لیے تمہارا ذکر اس سے آگے ہے ——— بی یانڈ فنیٹی!

ہنری طرح کے لفظوں میں، سارے فن ایک روز ختم ہو جائیں گے ۔ لیکن فن کار ضرور رہیں گے ۔ اور زندگی "ایک آرٹ" نہیں ہوگی، "آرٹ" ہوگی ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہنری طرح کا سوچا زمانہ ایک ہزار سال کو آجائے گا، تو یہ کہوں گی کہ وقت سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو جانا تمہارا قصور ہے ۔ یہ ہر اس کا قصور ہے، جو سر سے پاؤں تک جیتا ہے ۔ اس دنیا میں ابھی لوگ اس طرح نہیں ہوتے ۔ ہر کسی کا نصف کچھ پیدا ہوتا ہے نصف ماں کی کوکھ میں ہی مر جاتا ہے ۔ ہر انسان ابھی اپنا بہت سارا حصہ کوکھ کی قبر میں ہی دفنا کر پیدا ہوتا ہے، اور اس کے لیے کسی سالم انسان کو دیکھنے سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اس دنیا کی تیرے ساتھ لاپرواہی قدرتی ہے ——— یا یوں کہوں کہ ہر حال کی جڑیں صرف ماضی میں ہوتی ہیں، لیکن تمہارے ایسے اس کسی کا کیا ہو جس کے حال کی جڑیں صرف مستقبل میں ہیں۔ اگر ایک ہزار سال بعد شائع ہونے والی کسی اخبار کی جلد میں آج بازار میں خرید سکوں، تو میرا یقین ہے کہ میں اس میں، تمہارے کمرے میں بند پڑے تمہارے فن پاروں کی تفصیل پڑھ سکتی ہوں . . . . . .

پرفیکشن، جیا لفظ تمہارے ساتھ جسپاں نہیں کروں گی ۔ یہ ایک سرد سی اور ٹھوس سی شے کا احساس دیتا ہے اور یہ احساس کہ اس میں سے نہ کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا جا سکتا ہے ۔ لیکن تم ایک ارتقا ہو، جس سے روز کچھ جھڑتا ہے، اور جس کے اوپر روز کچھ اگتا ہے ۔ یہ پرفیکشن لفظ ایک گرجے کی دیوار پر لگی ہوئی مینے کی تصویر کی مانند ہے ——— جس کے آگے کھڑا ہونے پر بات کھڑی ہو جاتی ہے ۔ لیکن تمہارے ساتھ بات کرنے پر بات چلتی ہے ——— ایک

سہل انگاری کے ساتھ ـــــ جیسے ایک سانس میں سے دوسرا سانس نکلتا ہے ۔ تم ازندہ استخوان کے جلنے !

ایک بیگانہ ملک سے تم کو خط لکھتے ہوئے ، یاد آیا ہے کہ آج ۱۵ ۔ اگست ہے ، ہمارے ملک کی آزادی کا دن ـــ اگر کوئی انسان کسی دن کا نمائندہ بن سکتا ہو ا تو کہنا چاہوں گی کہ تم میرے ۱۵ ۔ اگست ہو ۔ میری ہستی کی اور میرے دل کی حالت کا یوم آزادی !

ذبرو ونیک (یوگوسلاویہ) ـ ـــــ امرتا

ایک سلسلہ

۵ فروری ، ۱۹۷۲ء کے "سٹیٹسمین" نے ایک آرٹیکل لکھا تھا ۔ ایک رومانی نظم میں ایک شاعر پڑوسیوں سے کرسیاں مانگ کر لاتا ہے ، اور خالی کرسیوں کو اپنی نظمیں سناتا ہے ۔ سوچتا ہے ، خالی کرسیاں سب سے اچھے سامعین ہوتی ہیں ـــ ان میں نہ جوش کا دکھاوا ہوتا ہے ، نہ وہ نظموں کو سنسر کرتی ہیں ۔ لیکن اس قسم کی خودی سے محروم ، ہمارے کتنے ادیب ہیں جو صرف کرسیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں ۔ قیام کے ہال کمروں میں کلچرل فرنیچر بننا ان کی آخری منزل معلوم ہوتی ہے " اور اسی مضمون کے اگلے حصے میں کچھ سطریں اس طرح تھیں " ـــ لیکن اصل ادیب اپنے ناظرین کی رگوں میں جیتا ہے ، ان کے خوابوں میں ، اور ان کی زندگی کے تاریک کونوں میں . . . . . "

یہ سب لکھتے وقت اس میں ایک تازہ ادداسی یہ بھی شامل تھی کہ ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کے لیے ایک یا دو ووٹوں کی بنا پر رکمنڈ ہوئی ایک معاصر کی کتاب تھی ، جو بڑی تو محسوس ہوا تھا ـــــ اس کتاب کو ایوارڈ ملنا نہ مصنف کے ساتھ انصاف تھا نہ پنجابی ادب کے ساتھ ۔ اس لیے میں نے اپنی آخری ووٹ اس کتاب کو نہیں دی تھی ۔ اور میرے معاصر نے اس بات سے مجھ سے ناراض ہو کر چنڈی گڑھ میں جو پیپر پڑھا تھا ، اس میں میرے ناولوں کو نادلچوپ کہہ کر اور نظموں کو نقل کہہ کر یہ ثابت کیا کہ ان کی برائی کی گئی تھی ۔ لیکن اس سال کے آخر میں اس ساری بات کی اور بھی مضحکہ خیز صورت دیکھنے میں آئی ـــــ جب جولائی کے آخری ہفتے میں ایک اور معاصر کے گھر بیٹھ کر اس معاصر نے شراب کا پیالہ ہاتھ میں پکڑ کر نشہ میں بگھاری . . . " آگئی ، بی بی قابو آگئی . . . . آگئی ، بی بی قابو آگئی . . . تین سال کے لیے قابو آگئی . . . "

اور اس نے سامنے بیٹھے ایک اور معاصر کو بتایا ـــ "میں بھارتی گیان پیٹھ کمیٹی میں آ گیا ہوں، اب تین سال بی بی کو ایوارڈ نہیں لینے دوں گا . . . " اور پاس بیٹھے ایک اور مہربان معاصر نے اس کی تضمین میں سانس دیا ـــ " آ گئی، بی بی قابو آ گئی . . . پانچ سال کے پیسے قابو آ گئی . . . " اور اس نے بتایا کہ ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکیٹو میں ہونے کا یہ امرتا کا آخری سال ہے ۔ آئندہ پانچ سالوں کے لیے نیا انتخاب ہوگا، ہم امرتا کو اکادمی کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیں گے ۔

میں وہاں ہوتی تو ایک کو اکادمی مبارک اور دوسرے کو گیان پیٹھ کی ممبری مبارک کہتی۔ مگر وہاں صرف موہن سنگھ تھا جس نے اس قسم کی بچگانہ حرکتوں کو صرف اداسی کے ساتھ دیکھا اور صبح میرے گھر آ کر مجھے اداسی سے سنایا۔ انعاموں اور رتبوں کی تیز روشنی میں بکھرے وہ لوگ خواہ مخواہ ہوا میں تلواریں چلا رہے ہیں، میں وہاں نہیں ہوں، کبھی بھی نہیں تھی نہ کبھی ہوؤں گی ۔ ایک ہی تمنا تھی، میں اپنے دل کے اور اپنے ناظرین کے دلوں کے کسی گہرے گوشے میں ہوؤں ۔ جہاں تک بھی جا سکی ہوں، ـــ صرف وہاں ہوں ـــ صرف وہاں . . . .

اس سال کے آخر میں پھر اسی قسم کے دن آئے ۔ چنڈی گڑھ سے ایک معاصر کا ٹیلی فون آیا ـــ

"اس بار کس کتاب کو ووٹ دینا ہے؟"

"جو آپ کو ایوارڈ کے قابل لگتی ہے، اس کو دے دیجیے!"

"اس کو جس نے لینن پر کتاب لکھی ہے؟"

"لینن پر اس کی کتاب بہت گھٹیا ہے!"

"ہاں، گھٹیا تو ہے، لیکن وہ بوڑھا ہو گیا ہے، اس کو ایوارڈ ملنا چاہیے" اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری نظر میں معیار کے حساب سے کس کو ایوارڈ ملنا چاہیے؟"

معیار کے مطابق، سامنے آئیں نو کتابوں میں سے صرف ایک کتاب تھی ـــ 'تین رائیں' ـــ جس کے پہلے حصے میں کسی کی پرانی روایت کو نئے سرے سے زندہ کیا گیا تھا، اور دوسرے حصے میں آج کی کہانی اور آج کی نثر کے اعلیٰ نمونے تھے، اس لیے اپنی رائے جس ایمان سے سوچی تھی، اسی ایمان سے بتا دی ۔ اور میرے معاصر کا فون بند ہو گیا ۔ پھر اور دن

سے سننگر میری رائے کا بندوبست کر لیا جائے گا اور ان دو رائوں کو ملا کر میری رائے کو رد کر دیا جائے گا۔ میعار کے متعلق کسی کی رائے مختلف ہو سکتی ہے، لیکن یہاں میعار کا سوال نہیں تھا یہاں ضد کا سوال تھا۔ اس لیے ضد نبھائی گئی اور ایوارڈ کا انتظام کر لیا گیا۔

پہلی جنوری، ١٩٧٣ء والے دن، ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکٹو ممبر ہونے سے پانچ سال کے بعد سرخرو ہوئی ہوں۔ کسی ذمہ داری سے سرخرو ہونا گو، رہائی، لفظ کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا، تاہم احساس ضرور رہائی جیسا ہے، اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ ان برسوں کے دوران جب سفارش کے فون آتے تھے، یا گھر کی گھنٹیاں بجتی تھیں، ہنس کر امروز کو کہا کرتی تھی —— "سب کو یہ سمجھا دو کہ میں پانچ سال گھر پر نہیں ہوں" لیکن اس آخری سال سفارش کے ساتھ کسی کے ہاتھ کسی کا تھریٹ، بھی آیا تھا کہ اگر اس کو اکادمی کا ایوارڈ نہ ملا تو وہ جی بھر کے میرے خلاف لکھے گا۔

اس لیے ممبری کا یہ آخری سال بیتنے کے بعد آج پہلی جنوری کے روز رہائی کا احساس ہے آج نوروز گویا اس آزادی کے لیے مجھے نئے سال کی مبارکباد کہہ رہا ہے۔

اس قسم کے واقعات کا سلسلہ بہت طویل ہے —— جب کبھی پنجابی نظم یا پنجابی کہانی کا انتخاب کرتی ہوں —— تھریٹ، آتے ہیں —— "اگر فلاں کی نظم یا کہانی نہ ہوئی تو فلاں پرچے کا ایک خاص ایڈیشن میرے خلاف نکالا جائے گا....." خاص ایڈیشن ممکن نہیں ہو سکتے تو مضامین تو ہو ہی سکتے ہیں۔ اور وہ اکثر چھپتے ہیں....

اسی طرح پنجاب کے کئی معاصروں کو مغالطہ پڑتا ہے کہ ٹیلی ویژن کا سارا کچھ میری صلاح کے ساتھ ہوتا ہے، مجھ سے پوچھ کر۔ وہ دو چار بار فون کرتے ہیں کہ اگلی بار ان کی نظمیں ہونا چاہئیں..... بتانے کی کوشش کرتی ہوں کہ میرا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں، لیکن دو چار ماہ بعد فون والوں کا لکھا ہوا کوئی مضمون چھپا ہوا نظر آتا ہے، یا سرکاری محکمے کو یا منسٹروں کو لکھے میرے خلاف خطوط کی صدا سنائی دے جاتی ہے.... سچ مچ بہت طویل سلسلہ ہے.... گننے پر ختم نہیں ہوتا۔ ہاں، میری تحریر کی پورنوگرافی، والا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ١٩٧٠ء کی ایشین رائٹرز کانفرنس کے موقعہ پہ مجھے اس کی استقبالیہ کمیٹی کی چیئرمین منتخب کیے جانے کے بعد "اوپر" سے دباؤ پڑا تھا جس کے باعث ایک سکریننگ کمیٹی بنا کر میری نظموں میں پورنوگرافی تلاش کی گئیں... اور معلوم ہوا —— ١٩٦٨ء کے

موقعہ پر میں نے چیکوسلاکیہ پر جو نظمیں رقم کی تھیں ——— وہ پورنوگرافی تھیں ۔ ۔ ۔ پورنو گرافی کی یہ تشریح شاید دنیا کے ادب میں اور کہیں نہیں ملے گی ۔ ۔ ۔

اخباروں کی عجیب رپورٹ

دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ۱۵ مئی ۱۹۷۳ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی تھی ۔ جن کو بھی ملی تھی، انہیں کچھ لفظ بولنے تھے، میں نے بھی بولے تھے، لیکن دوسرے روز ٹائمز آف انڈیا کی یہ رپورٹ بڑی عجیب تھی ——— میرے بارہ میں اور سیاہ لکشمی کے بارہ میں، کہ وہ دونوں مسرت کی اچھال میں گانے لگ پڑیں ۔ جو کچھ بولا تھا، ابھی یاد ہے حرف بحرف یہاں درج کر رہی ہوں، صرف اس رپورٹ کے جواب کے لیے ۔

کچھ عرصہ ہوا، ایک نظم لکھی تھی ——— اکھر (حرف): اس نظم کے کچھ مصرعے ہیں:-

ایک پتھروں کا نگر تھا

سورج ونش کے پتھر، اور چندر ونش کے پتھر

اس نگر میں رہتے تھے،

اور کہتے ہیں : ایک تھی سیلا (چٹان)، اور ایک تھا پتھر،

اور ان کا اس نگر میں ملاپ لکھا تھا ۔

اور انہوں نے مل کر ایک تنتر منتو یہ چکھا تھا

وہ شاید چقماق پتھر تھے جو پتھروں کی سیج پر سوئے ،

تو پتھروں کی رگڑ میں سے، میں آگ کی طرح پیدا ہوئی، آگ کے موسم میں،

میرہتی ہوائیں مجھے جہاں بی لے جائیں،

گرم راکھیں میرے بدن سے جھڑتیں،

پھر وہی ہوا کہیں سے دوڑتی آئی،

اور ہاتھوں کے اندر کچھ حرف لائی ۔

اور کہنے لگی ——— اگنی تھی، سیاہ لکیریں نہ جاننا،

یہ لکیروں کے گچھے، تمہاری آگ کے پھول ہیں ۔"

اور اس طرح کہنی ورہ گذر گئی آگئے تو:

"تمہاری آگ کی عمر ان حرفوں کو لگے!"

میں نے زندگی میں کوئی تمنا کی ہے، تو صرف یہ تمنا ——— کہ میری آگ کی عمر شباب، ان حروف کو لگ جائے۔ آج آپ نے، دہلی یونیورسٹی نے ——— ان حروف کو پہچانا ہے، ان کی آگ کو پہچانا ہے، اور اس پہچان کے لیے میں حروف کی اس آگ کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں!"

مذہبی جہاد

مہابھارت کا سب سے پرعظمت حصہ مجھے وہ لگتا ہے، جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کا جنگ چھڑنے لگتا ہے، تب یدھشٹر میدان جنگ کو اکیلا اور پیدل پار کرتا، سامنے غنیم کے لشکر میں کھڑے احباب سے جنگ کی اجازت لینے جاتا ہے۔ وہ دشمن فوج کی صفوں میں کھڑے بھیشم پتامہ کو آداب بجالاتا ہے اور کہتا ہے ——— "میں نے آپ کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ جنگ کی اجازت دیجیے اور فتح کی دعا دیجیے!" بھیشم پتامہ جواب دیتے ہیں ——— "اس جنگ میں میرا یہ جسم تو دریودھن کی طرف داری ہی کرے گا کیونکہ اس کا نمک کھایا ہے، لیکن مذہب سے وابستہ دل تمہاری طرف رہے گا، تمہارا بھلا چاہے گا، تمہاری جیت چاہے گا!" یدھشٹر اسی طرح گورو درونا چاریہ کو بھی آداب بجالایا، کرپا چاریہ کو بھی! میں نے اپنے معاصروں کے ساتھ عمر جتنی لمبی جنگ لڑی ہے، اب اس کتاب میں ان کے بارہ میں جو کچھ بھی لکھنے لگی ہوں، ان کی قلموں کا احترام کرتے ہوئے، ان سے ہی نیک خواہشات چاہتی ہوں کہ اصولوں کی اس جنگ کو پوری طرح سے قلم بند کر سکوں۔

مہابھارت کی اسی جنگ میں یدھشٹر نے ہر طرف کی افواج کے درمیان کھڑا ہو کر کہا تھا ——— "جو بھی بہادر سپاہی میری امداد کے لیے میری فوج میں شامل ہونا چاہے، اس کو خوش آمدید ہے!"

اور یہ سن کر دریودھن کا چھوٹا بھائی یویوتس آگے بڑھا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج وہی لفظ نئے ادیبوں کے لیے دوہرائی ہوں کہ جس نے اصولوں کی لڑائی لڑنا ہے،

اس کا استقبال ہے۔ یہ جنگ جاری رہے گی ـــــــ میرے تک اور میرے بعد بھی۔ اور صرف آج کی نہیں، آنے والی نسلوں میں سے بھی جو کوئی قلم کے سچ کی صف میں آنا چاہے گا، وقت اس کا استقبال کرے گا . . . . .

منتہاس (روائتی تواریخ) میں جس طرح کئی چہرے، بیگانے چہروں کا روپ دھار کر کسی کو فریب دیتے نظر آتے ہیں، زندگی میں بھی کئی اعتقاد اور کئی امیدیں فریب کار ہوتی ہیں۔ ادبی دنیا میں سنت سنگھ سیکھوں کے بارہ میں میری پہلے روز سے رائے تھی کہ ایک تنقید نگار ہونے کے ناطے ان کا ذمہ داری اور ایمان داری ایسی بنیادی قدروں کے ساتھ بالکل ہی کوئی واسطہ نہیں۔ جوں جوں سال بیتتے گئے، میری رائے بڑی صحیح ثابت ہوتی گئی۔ موہن سنگھ جی کے بارہ میں میری رائے تھی کہ وہ اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے دل کے انسان ہیں لیکن کمزور، قدروں قیمتوں کے لیے ڈٹ جانے والے نہیں! میری یہ رائے بھی وقت پاکر صحیح ثابت ہوئی۔ لیکن توتیج سنگھ کے بارے میرا مضمون "میرا دوست، میرا ہمدم" اور کرتار سنگھ دگل کے متعلق میرا مضمون "ٹھنڈا دستانہ" ان کے لیے میرے معاصرانہ پیار کو دیکھتے دیکھتے جھٹلا گئے۔ پہلا مضمون ایک یقین کے ساتھ اور دوسرا ایک امید کے ساتھ لکھا تھا، لیکن میرا یقین بھی مجھے فریب دے گیا، میری امید بھی! ہربھجن سنگھ کے ساتھ امید لگائی تھی، لیکن زیادہ نہیں، انہوں نے جب اپنے پیروؤں سے میرے متعلق گھٹیا مضامین لکھوا کر ان میں ایک لذت لینا شروع کی، مجھے زیادہ حیرت نہیں تھی ہوئی، صرف رحم آیا تھا کہ وہ اپنے اندر کے شاعر کی شخصیت کو اپنے ہاتھوں کثیف بنا رہے ہیں۔ اور جو سادھو سنگھ ہمدرد یا کوئی اپنے دلوں کی تنگ گلیوں میں بھٹکنے، جو کچھ بھی کر رہے ہیں، ان کے ساتھ میرا کچھ بھی مشترک نہیں، نہ کوئی یقین نہ کوئی امید، اس لیے نہ اس کی کوئی حیرت ہوتی ہے، نہ درد۔ گوربچن سنگھ بھلر نے جب میرے اور ہربھجن سنگھ کے خلاف ایک افسانہ گھڑا، جو قطعاً کذب پر استوار کیا گیا تھا، تو اس تماشہ کو دیکھ کر صرف افسوس کے ساتھ مونہہ پرے کر لیا۔ یہ افسانہ پریت لڑی کے مئی ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

اسی ماہ پندرہ تاریخ کو دلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری ملی تھی۔ دوستوں کے اور ناظرین کے خط آرہے تھے اور ان میں ایک خط گوربخش سنگھ جی کا بھی ملا۔ اپنی ادبی

زندگی کے ابتدائی سالوں میں، میں نے گوربخش سنگھ جی کے ساتھ آدرش ایک لفظ کو ہی جوڑا تھا اور دل کے گہرے احترام کو بھی۔ اور اس کے ساتھ اس امید کو بھی، اب قدروں اور قیمتوں کی حفاظت ان کے ذمہ ہے۔ ان کے بزرگ ہاتھ کے رہتے مجھ ایسے نئے ادیب کے لیے کیچڑ سے بھری گلیوں میں سے گذرنا کچھ سہل ہو جائے گا۔ لیکن دیکھا تھا وہ بہت جلد اس سب کچھ سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ ٹھیک تھا، اپنے راہ اپنے پاؤں چلنا تھے، اس لیے دل میں کوئی گلہ نہیں تھا آنے دیا، نہ گلہ، نہ امید! تاہم ان کے لیے کچھ احترام کا رشتہ میں نے اپنے دل میں ہمیشہ بنائے رکھا۔ ان کی سوانح عمری میں اپنے متعلق کچھ تعریفی سطریں پڑھ کر ایک خط بھی رقم کیا تھا "آپ کی سطروں کو میں نے خلعت کی طرح زیب تن کیا ہے" اور ان کا بھی جواب میں شیریں سا خط آیا تھا۔ لیکن جب پریت لڑی نے میرے خلاف کہانی شائع کی، تو امرتا کو ایک مغالطے کا کچھ وہ مقام نظر آیا، جہاں کھڑے ہو کر اس نے سوچا "ہو سکتا ہے، کہانی چھپنے سے قبل گوربخش سنگھ جی نے نہ پڑھی ہو اور اس کا انتخاب صرف نو تیج سنگھ کا انتخاب ہو" سو اس نے اس روز ایک خط گوربخش سنگھ جی کو لکھا ——— صرف سردار گوربخش سنگھ جی کے نام!

"مئی کی پریت لڑی پڑھی۔ حیرت ہے کہ 'مکسوٹی' ایسی کہانی آپ نے کیسے شائع کر دی۔ جو کہانی کے طور پر بھی پست ہے اور جس نیت سے لکھی گئی ہے، وہ بھی پست ہے۔ یہ جھوٹی کہانی ہے۔ امرتا کو اس طرح کی تحریروں سے کوئی فرق نہیں پڑنے لگا، لیکن جس صحیفے میں اس قسم کی تحریر شائع ہوتی ہے، اس صحیفے کے متعلق اور اس کے مدیروں کے متعلق اپنے نقطہ نظر میں ضرور ایک فرق پڑ جاتا ہے۔ یوں تو پنجابی کے بہت سے پرچے ہر ماہ اکثر اس قسم کی ہوتیانہ تحریریں لکھ لکھ کر اور چھاپ چھاپ کر کاغذ اور حروف میلے کرتے ہی رہتے ہیں۔ لگتا ہے۔ آپ نے یہ افسانہ شائع کرنے سے پہلے پڑھا نہیں۔ اور اگر واقعی ہی نہیں پڑھا، تو آپ نے ہمارے ساتھ اور اپنے پرچے کے ساتھ برا کیا ہے، ایک بری کہانی کی طرح۔ پریت لڑی کو گھٹیا اور سکینڈلس پرچوں کی قطار میں کھڑا کر کے آپ نے اپنے ساتھ بھی برا کیا ہے۔ ایک گلے کے ساتھ ایک احترام کے ساتھ ———

آپ کی، امرتا"

۲۱ - ۵ - ۱۹۷۲

اسی شام ایک سبب تھا ——— کہ لندن سے آئے اوتار جنڈیالوی نے امروز کو کناٹ پلیس میں ملنا تھا۔ ساڑھے چھ کا فون پر وقت دیا ہوا تھا۔ میں نے سات بجے حیدرآباد سے آئی ادیبہ جیلانی بانو سے وہاں ولینگٹن کورٹ میں ملنا تھا۔ اس لیے امروز کے ساتھ ہی گئی تھی۔ اوتار جنڈیالوی وقت پر آ گیا لیکن ساتھ میں ہری بھجن سنگھ بھی تھا۔ اوتار نے چائے پینے کے لیے کہا۔ اوتار، ہری بھجن، امروز اور میں ریگل میں جا کر سرد کافی پینے پڑے۔ ہم سب باتیں کرنے لگے لیکن کھوکھلی کھوکھلی باتوں کا کچھ رخ موڑنے کے لیے میں نے ہری بھجن سے کہا ——— "اس بار پریت لڑی نے بڑے پیار سے آپ پر ایک کہانی شائع کی ہے!" ——— ہری بھجن سنگھ نے سطحی ہنسی کے ساتھ کہا ——— "وہ آپ کے خلاف بھی تو ہے!" کہا ——— "میرے تو ہے ہی، لیکن میں تو اس قماش کی چیزیں پڑھ پڑھ کر ان کی خوگر ہو چکی ہوں!" اور میں نے ہری بھجن سنگھ کی جانب دیکھا۔ دیکھنے کے معنی تھے ——— مجھے اس برداشت کی خوگر بنانے میں تم بھی تو شامل ہو۔ تمہارا بھی شکریہ! کچھ دیر بعد ہری بھجن سنگھ نے کہا ——— "لیکن نوتیج نے کس خیال سے شائع کی؟ کم سے کم کہانی کے طور پر تو اچھی ہوتی۔ بیچارے پڑھنے والوں کو کیا ملا!" جواب دیا ——— "بیچارے پڑھنے والوں کی قیمت پر دو آدمیوں نے لذت لے لی، ایک لکھنے والے نے، ایک چھاپنے والے نے!" ہری بھجن سنگھ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک کہا ——— "صرف دو آدمیوں نے نہیں، میں نے بھی کچھ لذت لی ہے، یہ کہ ——— گربخش سنگھ اب اس قسم کی پست کہانیاں لکھنے والا بن گیا ہے!" کہا ——— "لیکن مجھے اس بات کا دکھ ہے "بنجر مرد" ایسی عمدہ کہانی لکھنے والا گربخش سنگھ اب اس طرح کی پست کہانیاں لکھنے لگ گیا ہے، یہ دکھ ہے"! مجھے یہی محسوس ہوا تھا، کہہ دیا۔ اور پھر ریگل سے اٹھ کر میں اور امروز اکیلے ہوئے تو صرف امروز سے کہا ——— "بس یہی برا پہلو ہے ہری بھجن کا۔ آج بے ساختہ اس کے منہ سے جو کچھ نکلا، وہ اس کی دوہری شخصیت کو بے نقاب کر گیا۔ ایک اچھے بن رہے ادیب کا یوں پستی میں گر پڑنا اس کو لذت دیتا ہے، اس کو یہ درد نہیں اٹھتا کہ ہمارا ایک افسانہ نویس ختم ہو گیا۔۔۔"

وقت تھا ——— جب ۱۹۶۰ میں، میں امروز کا ساتھ چھٹتے وقت دل کی بڑی نازک حالت میں تھی۔ اس وقت میں نے اس ہستی کو یاد کیا جس نے مجھے پیدائش دی تھی۔ لیکن وہ

جھرو اب دنیا میں موجود نہیں تھا، اس لیے اس تشبیہ کو گوربخش سنگھ جی کی صورت میں سے دیکھنا جا رہا تھا۔ خط لکھا تھا ـــــ "جس ہستی کو دار جی، پکارا کرتی تھی، آج وہ دنیا سے آپ وگل میں نہیں ہے۔ وہ لفظ آج آپ کے لیے استعمال کرتی ہوں۔ آپ ایک دو روز کے لیے میرے پاس آئیں۔ میں دل کے کرائسس میں مبتلا ہوں!" اس خط کے اب مجھے صحیح لفظ یاد نہیں، تاہم اس کے معانی امانتاً یہی تھے۔ لیکن خط کے جواب میں گوربخش سنگھ جی نہیں آئے۔ خیر! میری اداسی نے ہی مجھے قوت عطا کر دی اور میں اکیلی اس پریشان حال سے نکل آئی۔ لیکن جب بچپن نے کسی شخصیت کے اثر کو گہرائی سے قبول کیا ہو، اس کی جوانی بھی اس اثر کا ٹکڑا گلے سے لگا کر رکھتی ہے۔ اور پھر اس کی پیری سالی بھی اس کو اپنے ماضی کی کمائی سمجھ کر اپنی کسی جیب میں ڈالے رہتی ہے۔ میں نے گوربخش سنگھ کے اس اثر کے تحت ان کی جانب سے آنے والے خط کے نقوش کا تصور بھی قائم کر لیا تھا۔ صرف نقوش نہیں حرف حرف اس کی صورت قیاس کر لی تھی۔ میرے قیاس میں ان کا خط تھا ـــــ "پیارے امروز! میری پریت لڑی میں اس طرح کی فالتو کہانی چھپنے پر بھی تمہارا احترام قائم رہا ہے، میں تمہارے اس احترام کو پیار بھیجتا ہوں۔ اور جس طرح تمہیں محسوس ہوا ہے کہ یہ کہانی چھپنے سے قبل میں نے نہیں پڑھی، وہ ٹھیک ہے۔ مجھ پر تمہارا یقین سچا ہے۔ یہ کہانی اگر میں نے پڑھی ہوتی تو شائع نہ ہوتی!" لیکن یہ خط میرے قیاس میں پھولوں کی طرح کھلا اور اس کے بجائے جو خط آیا، اس کو پڑھ کر اس کا حرف حرف مرجھا گیا۔ میرے خیال میں ـــــ ایک ادیب کی پہلی وفا اپنی قلم کی اقدار کے ساتھ ہوتی ہے، اور بیٹے بیٹی چاہے کتنے بھی عزیز ہوں، ان کے ساتھ یہ وفا ثانوی درجہ پر ہوتی ہے۔ لیکن گوربخش سنگھ جی نے اپنی قلم کے ساتھ اپنی وفا کا حق نہیں تھا ادا کیا۔ میرا درد یہ تھا۔ وہ کہانی میرا درد نہ تھی۔

گوربخش سنگھ جی کی طرف سے امروز کے خط کا جواب آیا، لیکن ان کے اتنے کمزور جواب سے ان کے لیے میرے احترام کو بھی ایک بار شرم آ گئی۔ ان کے خط میں بجائے کچھ افسوس کے، لکھا تھا ـــــ "میں سمجھا دوں گا کہ آپ پھر اس کہانی کو پڑھیں!" حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کہانی کے مصنف نے ایڈیٹر کو پہلے ہی لکھا تھا کہ یہ کہانی دو معاصروں کے خلاف ہے، لیکن اگر ہمت وجرأت ہے، تو شائع کر دیجئے! اور ایڈیٹر نے یہ ہمت وجرأت کر لی تھی۔ سوجان بوجھ کر شائع کی کہانی کو اب وہ کہہ رہے تھے کہ یہ امرتا کے خلاف نہیں، اور اس

کہانی کو پھر پڑھنے کا سمجھاؤ دے رہے تھے۔ یہاں، اس دوسرے ایڈیشن میں، کچھ اور سطریں کہنی ضروری ہیں ——— رسیدی ٹکٹ کے پہلے ایڈیشن کے بعد اچانک ایک روز نوتیج کا فون آیا ——— "یہ بات غلط ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں بولتا، میں صرف آپ کے بارہ میں نہیں بولتا،" دو روز قبل نوتیج کارڈ کا سومیت مجھ سے ملنے آیا تھا، اپنی نئی کہانی کی بات کرتا رہا تھا، ناگ منی کے لیے، اور میں نے کہا تھا ——— ناگ منی کے کئی کالم ہیں، ان میں تم بھی لکھو، اپنے پاپا سے بھی کہو، اگر وہ چاہیں تو ضرور لکھیں!" اور اس نے کہا تھا "——— میں تو لکھوں گا، لیکن ان کو آپ خود کہیں!" اور میں نے ہنس کے کہا تھا ——— "وہ میرے ساتھ نہیں بولتے ——— "شوبہ لیپ منظر تھا جس کے جواب میں نوتیج نے فون کیا اور پھر مل کر کہا ——— "آیئے ہماری غلط فہمیاں دور کر لیں!" ہم کئی گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ نوتیج کی دوستی کو پھر سے حاصل کر کے مجھے سچ مچ کچھ کھویا ہوا مل رہا تھا۔ اس لیے جب اخیر میں نوتیج نے کہا ——— "آپ کے خلاف میں نے جو کچھ شائع کیا ہے، جان بوجھ کر نہیں، بس، مان لیجیے کہ وہ انجانے ہوا تھا" اور میں نے جواب دیا ——— "نوتیج! اگر تم میں یہ کہنے کی جرأت ہے، تو مجھ میں اس کو مان لینے کی جرأت ہے!"

انسان چاہے تو ہر حادثے سے بڑا ہو سکتا ہے۔ حادثے تو کھڈیں کھائیں ہوتے ہیں، جن پر سے گذر سکنے کی قوت انسان کے پاؤں میں ہونی چاہیئے۔ سو میں نے اور نوتیج نے اس مذکورہ بالا حادثہ کو عبور کر لیا ہے۔ اب اس کا ذکر محض ماضی کے مشکل لمحات کی تاریخ کی مانند ہے۔

مجھے نہیں معلوم، کسی اور زبان میں یوں ہوتا ہے یا نہیں، لیکن پنجابی پریس میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ کوئی بھی خبر، جیسے چاہو، گھڑی جا سکتی ہے۔ جنوری ۱۹۷۵ء میں ناگ پور کے مقام پر عالمگیر ہندی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ۳۰ ملکوں کے سو سے زیادہ نمائندوں نے حصہ لیا تھا، ان کو اعزاز دیتے ہوئے اس کانفرنس نے بھارت کی ۱۵ زبانوں کے ۱۵ ادیبوں کو بھی اعزاز دیئے تھے جن میں سے ایک میں بھی تھی، پنجابی ادیب ہونے کے ناطے۔ اس خبر میں مغالطے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن میرے معاصروں کے ایک پرچے نے لکھا مجھے مخاطب کر کے ——— "آپ نے عالمی ہندی کانفرنس، ناگ پور میں ہندی ادیب کے طور پر اعزاز لیا، حالانکہ آپ کی ہندی میں شائع ہوئی سبھی کتابیں ترجمے ہیں، اور آپ نے اس راز کو چھپا کر اپنی زبان سے غداری کی

ہے! ۔۔۔ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اس پرچے کے ساتھ جو ادیب متعلق ہیں، وہ دہلی یونیورسٹی میں پڑھانے والے لوگ ہیں۔ اس قسم کی ذمہ دار جگہ پر بیٹھے لوگوں کو منطق اور دلیل کی ضرورت نہیں ملی۔ اگر وہ ایک سیدھی سادی خبر کو یوں توڑ مروڑ سکتے ہیں تو عام پریس سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں . . . . . .

کمیونسٹ پریس کو عام لوگوں کے پریس کے معیار سے بلند خیال کرنا قدرتی ہے لیکن عوامی لہروں سے جڑا ہوا پریس سنجیدہ اور مدبر ہونے کے بجائے کس قسم کا ہے، اس کی ایک خوفناک مثال میرے سامنے ہے۔ یکم اگست ۱۹۷۵ء کے روزنامہ اخبار لوک لہر، میں جس طرح کا پست خیالات کا حامل مضمون شائع ہوا، میری رائے میں دنیا کے کسی پریس میں نہیں شائع ہو سکتا۔ میرے ماہنامہ ناگ منی، کو تھرڈ اور فحش کہا گیا جس کی دلیل یہ تھی کہ چیکوسلواکیہ کے حادثہ کے موقعہ پر میں نے نظمیں لکھی تھیں اور مجھے تین رات نیند نہیں آئی تھی . . . . اور یہ معنی۔ دل جتنے پست الفاظ میں لکھا گیا، وہ شاید دنیا کے کسی پریس میں نہیں چھپ سکتے۔

سب سے اداس بات یہ ہے کہ پنجابی پریس کے کسی بھی کونے سے اس سب کچھ کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی . . . . . کبھی دل بھر آئے تو صرف نظم لکھ سکتی ہوں، وہ لکھ لیتی ہوں، اور کچھ بھی ممکن نہیں۔ ایسے ہی کسی موقعہ پر لکھا تھا ۔۔۔ "پرچھائیوں کو پکڑنے والو! سینے میں فروزاں آگ کی پرچھائیں نہیں ہوتی!"

یہ سب کچھ ٹھیک ہے، تاہم یہی سب کچھ نہیں۔ جس کے ہاتھ میں بھی قلم ہے، وہ زمین کی مانند قلم کی اولاد ہے، اس لیے ان میں باہمی نزدیکی رشتہ ہے۔ ستی اور ہری بھجن کی قلم میں جو بھی زور ہے، وہ اسی رشتے کے پیش نظر مجھے اپنا لگتا ہے۔ اور اسی لیے ان سے مایوس ہونے دل میں ایک سوز بھی شامل ہے، ایک یاس انگیز اداسی بھی!

جانتی ہوں ۔۔۔ قلم کے رشتے سے وہ لوگ میرے دل کے اس اپنے پن کو نہیں سمجھیں گے، یہ قدریں قیمتیں ان کے دل کا حصہ نہیں، یہ صرف میری ہیں۔ یہ صرف میں جانتی ہوں کہ صرف وہ نہیں، دنیا کے کسی حصے میں جو کوئی بھی قلم کے دھنی ہیں، وہ میرے ہیں، میرے ماضی کا، میرے حال کا، اور میرے مستقبل کا حصہ۔ میرے دل کی حالت صرف میری حدوں تک محدود نہیں، نہ جسم تک، نہ زمانے تک۔ وہ کوئی وہ بھی ہو سکتے ہیں جو مجھ سے ہزاروں سال قبل ہوئے ہوں، اور وہ کوئی وہ بھی ہو سکتے ہیں جو مجھ سے ہزاروں سال بعد ہوں گے . . . . .

دیکھے سنے یا ہوئے واقعات

زندگی کے دیکھے، سنے یا وقوع میں آئے واقعات —— کب اور کس طرح تصنیف کا حصہ بن جاتے ہیں کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر، یہ کسی حساب کی پکڑ میں نہیں آتا۔ خصوصاً غیر شعوری طور پر جو تجربہ کسی تحریر کا حصہ بن جاتا ہے، کئی بار اپنی آنکھوں کے لیے بھی اچنبھا سا ہو جاتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور سے جب ملی تھی، بہت کم سن تھی۔ نظمیں اس وقت بھی لکھتی تھی، لیکن انجان سی، انہوں نے جب ایک نظم سنانے کے لیے کہا تو جھجکتے جھجکتے سنائی تھی۔ لیکن انہوں نے جو پیار اور توجہ دی تھی، وہ نظم کے مطابق نہیں تھی، ان کی اپنی شخصیت کے مطابق تھی۔ وہ تاثر مجھ پر بہت گہرا تھا۔ اور پھر جب ٹیگور کا صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا، میں نے ان پر ایک نظم لکھنا چاہی۔ کچھ سطریں لکھیں بھی، لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ اور میں ماسکو چلی گئی (۱۹۶۱ میں) وہاں جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوئی تھی، اس کے مقابل مایاکووسکی کا بت نصب تھا۔ اور جس مقام پر وہ ہوٹل تھا، اس کا نام گورکی سٹریٹ تھا۔

ایک رات، قریب دس بجے تھے، میں نے ہوٹل کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ بہت سے لوگ مایاکووسکی کے بت کے گرد جمع تھے۔ معلوم ہوا کہ کئی نوجوان شاعر اکثر رات کے وقت یہاں آ کھڑے ہوتے ہیں اور بت کے چبوترے پر کھڑے ہو کر کبھی وہ مایاکووسکی کی کوئی نظم پڑھتے ہیں اور کبھی اپنی۔ راہ چلتے لوگ ان کے گرد آ جمع ہوتے ہیں اور نظمیں سنتے ہیں۔ فرمائشیں بھی ہوتی ہیں اور یوں یہ کھلا مشاعرہ آدھی رات تک چلتا رہتا ہے۔ ہوا میں خنکی آ جائے تو لوگ اپنے کوٹوں کے کالر اونچے کر لیتے ہیں، پانی برسنے لگے تو سروں پر چھاتے تان لیتے ہیں۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے اکوٹ پہن کر اس کھلے مشاعرے میں چلی گئی۔ گو مجھے روسی زبان کا کوئی لفظ سمجھ نہیں آیا، لیکن ان کی آواز کی حرارت مجھ کو ضرور سمجھ آ گئی۔ پھر جب میں اپنے کمرے میں لوٹی، میرے سامنے ٹیگور کا چہرہ بھی تھا، مایاکووسکی کا بھی، اور گورکی کا بھی۔ سارے چہرے باہم مل گئے گویا ایک ہو گئے اور اس رات مجھ سے ٹیگور والی نظم مکمل ہو گئی ——

محرمِ الٰہی حسن کی ، قاصد انسانی عشق کی
یہ قلم لافانی بیتری ، سوغات فانی جسم کی

"اک دالوٹا" ناول میں، اس کا اہم کردار جب روز شام ڈھلے سٹیشن پر جا کر آنے والی گاڑیوں میں اپنی کھوئی ہوئی بہن کا چہرہ ڈھونڈتا ہے، تو ایک روز زبردستی اس کے پاؤں اپنے گاؤں کو جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ سردی کے دن، پاس کوئی گرم کپڑا نہیں، وہ رات کے پالے میں سکڑوں سا بیٹھ جاتا ہے۔ فکروں میں غرق اس کا دل نیند میں بھی غرق ہو جاتا ہے کسی سٹیشن پر گاڑی رکتی ہے تو اترتی چڑھتی سواریوں کی کھٹ کھٹ سے وہ بیدار ہو جاتا ہے ——— دیکھتا ہے، اس کے گرد ایک رضائی لپٹی ہوئی ہے . . . . ایک بڑے ملائم چہرے والا ایک معمر آدمی ساتھ کی نشست پر بیٹھا ہوا ہے ——— کھیس اوڑھ کر، اور اپنی رضائی اس پر دے کر ——— ایک روز اچانک اس ناول کا یہ حصہ سامنے آیا تو یاد آیا ———
اس ناول کو لکھنے سے چار سال پہلے ——— میں جب رومانیہ سے گاڑی میں بلغاریہ جا رہی تھی، رات بڑی خنک تھی۔ پاس اپنے کوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہی گھٹنوں کو سکیڑ کر اوپر تان لیا تھا۔ پھر بھی اس کو سر کی طرف کھینچتی تھی، تو پاؤں ٹھٹھرتے تھے، پاؤں کی طرف کرتی تھی تو سر اور کندھے ٹھٹھرتے تھے۔ معلوم نہیں، کس وقت کچھ نیند آ گئی ——— تب محسوس ہوا، سارے بدن کو حرارت پہنچ گئی ہے۔ رہتی رات بہت گرم ہو کر سوئی رہی۔ صبح سویرے بیدار ہوئی تو دیکھا ——— میرے والے ڈبے میں سفر کرتے ایک بلغاروی مسافر نے اپنا اوورکوٹ میرے اوپر رضائی کی مانند اوڑھا رکھا ہے۔

یہ واقعہ میں نے شعوری طور پر اس ناول میں شامل نہیں کیا تھا، لیکن لکھ چکنے کے کتنا عرصہ بعد جب پڑھا تو لگا ——— اس رات کی گرمی میری رگوں میں کہیں ایک امانت کی طرح پڑی ہوئی تھی۔

"یاتری" ناول ۱۹۷۸ء میں لکھا تھا۔ اس کی ایک کردار، سندراں، خالصتاً تخیل کی پیداوار تھی۔ ناول کے ہیرو کی پیدائش کا قصہ بھی جانتی تھی۔ اس کے متعلق لکھا بھی تھا ——— "ہیرو کو جانتی ہوں ——— اس دن سے جب اس کو سادھوؤں کے کسی ڈیرہ میں بھینٹ کیا گیا تھا۔ بہت سالوں کی بات ہے، لیکن آج بھی تصور میں لاؤں تو بڑے تراشے ہوئے نقوش والا اس کا سانولا چہرہ بمعہ اس کی ساری اوداسی کے، آنکھوں کے آگے آ جاتا ہے۔" لیکن سندراں

میرے تخیل میں سے نکل کر اس ناول کے صفحات پر اتری تھی۔ اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سندراں کی کردار نگاری کرتے ہوئے میری آنکھیں کیوں بار بار بھر آتی رہی تھیں۔

ناول لکھ کر ـــــ سب سے پہلے امروز کو سنایا تھا۔ اور سناتے سناتے جب سندراں کا ذکر آیا میرا اپنا کلیجہ جیسے مٹھی میں بھر آگیا۔ پھر اس ناول کا ہندی میں ترجمہ ہوا۔ ہر ترجمہ چھپنے سے قبل سنا کرتی ہوں، اور اس کو سنتے ہوئے پھر جب سندراں کا تذکرہ آیا، میں بے چین ہو اٹھی۔

ناول ہندی میں چھپ گیا۔ اس وقت ۱۹۶۹ء تھا۔ پنجابی میں دو برس بعد شائع ہوا تھا ـــــ ۱۹۷۱ء میں۔ اور اس کے پروف دیکھتے ہوئے پھر جب سندراں آئی، میں بے قرار ہو گئی۔

اپنے آپ کو، اس اپنے دل کو پہنچتے جھٹکے کا کچھ پتہ نہیں لگتا تھا۔ لیکن ۱۹۷۲ء میں جب اس ناول کا انگریزی ترجمہ ہو رہا تھا ـــــ تو اس وقت جب سندراں سامنے آئی تو یوں محسوس ہوا ـــــ گویا میں آپ اپنی نبض دیکھ رہی ہوؤں.....

مصنف کی اپنی زندگی کے حادثے، ناولوں کہانیوں کے کرداروں میں ہمیشہ داخل ہوا کرتے ہیں۔ سینے سے اٹھتے ہیں، کاغذوں پر جا کر بکھرتے ہیں، لیکن یہ سندراں اس کے برعکس تجربہ ہے۔ یہ کاغذوں سے اٹھ کر میرے سینے میں داخل ہو رہی تھی۔ اور اچانک محسوس ہوا ـــــ یکبارگی جیسے گھپ اندھیرے میں چراغ جل اٹھے ـــــ کہ یہ سندراں میں تھی.....

"میں" کو میں نے شعوری طور پر سندراں میں داخل نہیں کیا تھا، اس لیے کئی سال اس کو پہچان نہیں سکی تھی۔ یہ اپنا وجود مجھے اندر سے کھرچتی تھی، دل کی تہوں کو ہاتھ ڈالتی تھی، تب بھی پہچان میں نہ آتی تھی۔ لیکن جب پہچانی گئی ـــــ تو اپنی ایک ایک سوچ تک پہچانی گئی....

سندراں جب مندر میں جا کر شو پاربتی کے پاؤں پر پھولوں کی جھولی الٹتی ہے کہ وہ جب شو پاربتی کے پاؤں پر سجدہ کرنے تو پھولوں کے ڈھیر کے نیچے سے ہاتھ گذار کر ـــــ مورتیوں کے پاس کھڑے اپنے محبوب کے پاؤں کو بھی ہتھیلی سے چھوئے اور اس کی ہتھیلی کسی کی نظر میں نہ آئے۔ محسوس ہوا ـــــ یہ میں ہوں جو برسہا برس ایک چہرے کو یوں تصور میں لاتی رہی تھی کہ حرفوں کے حرف پھولوں کے ڈھیر کی طرح لگا دئے تھے، اور

جس کے پیچھے سے بازو بڑھا کر کسی کو اس طرح چھو لینا چاہتی تھی جو ـــــــــ اور پرسے، کسی دیکھنے والے کو دکھائی نہ دے۔

سندراں کتنا عرصہ ـــــ چپ چاپ ـــــ پھول چنتی رہی اور سب سے چوری اپنے محبوب کے پاؤں کا لمس لیتی رہی۔ میں سالہا سال نظموں کے حروف جوڑتی رہی، اور چپ چاپ اپنے محبوب کے وجود کو چھوتی رہی . . . . .

سندراں کا محبوب ـــــــ جیتا جاگتا بھی ـــــ پتھر کی مورتی ایسا تھا جس کو سندراں کے دل کی آنچ نہیں پہنچتی تھی۔ اور میں بھی سالہا سال سندراں والی جگہ پر کھڑی رہی تھی ـــــ میرے دل کی آنچ بھی کہیں نہیں پہنچتی تھی۔ ایک پتھر الیسی خاموشی کے ساتھ مکراتی تھی اور جلتی بجھتی پھر میرے پاس ہی لوٹ آتی تھی۔

سندراں گلے میں عروسی لباس اور ناک میں سونے کی نتھ ڈالے جب مندر میں اپنے محبوب کو آخری سلام کرنے آتی ہے، کچھ آنسو چھلک کر اس کی نتھ کے تار کے ساتھ اٹک جاتے ہیں ـــــ جیسے نتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہوں ـــــــ اور یہ ساری کی ساری میں تھی ـــــــ میری ہر انگھوٹھی، چھلے کی آنکھوں میں اسی طرح ہی آنسو بھر بھر آتے تھے . . . .

اور خدایا! کبھی اپنا آپ بھی خود سے یوں چھپ چھپ جاتا ہے . . . . . یہ لاشعور کا کیسا عجیب کھیل ہے؟

پورے گیارہ سال کی نہیں تھی جب ماں فوت ہو گئی تھی۔ ماں کی زندگی کا آخری دن ننھی سے ننھی تفصیل کے ساتھ میری یاد میں محفوظ ہے۔ "اک سوال" ناول میں ناول کا ہیرو جگدیپ مرتی ماں کے بستر کے پاس جس طرح کھڑا ہے۔ اسی طرح میں اپنی مرتی ماں کے بستر کے پاس کھڑی تھی۔ اور میں نے جگدیپ کی مانند دل اور ذہن کی یکسوئی کے ساتھ خدا سے کہا تھا "میری ماں کو نہ مارنا!" اور مجھے بھی اس کی طرح یقین ہو گیا تھا کہ اب میری ماں نہیں مرے گی کیونکہ خدا بچوں کا کہا نہیں ٹالتا . . . . . لیکن ماں مر گئی تھی اور میرا بھی جگدیپ کی طرح خدا پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا۔

اور جس طرح جگدیپ اس ناول میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی اور ایک طاق پر رکھی ہوئی دو سوکھی روٹیوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیتا ہے ـــــ ان روٹیوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے

کئی دن کھاؤں گا ـــــ" اسی طرح میں نے ان سوکھی روٹیوں کو پیس کر ایک شیشی میں ڈال لیا تھا۔ ۔ ۔

یہ سب کچھ میں نے شعوری طور پر اس ناول میں داخل کیا تھا۔ لیکن یا تری کا ناول میں مہنت کرپا ساگر کے کسی بھی بیان میں میں نے شعوری طور سے اپنے والد کی یاد داخل نہیں کی تھی۔ لیکن کئی سال بعد میں نے اس ناول کو پڑھا۔ اور جب مہنت کرپا ساگر کی موت کے بعد ناول کا ہیرو اس کی آواز کو دل میں یاد کرتا ہے، تو مجھے یوں محسوس ہوا ـــــ یہ میں خود اپنے باپ کی آواز کو یاد میں لا رہا تھی ـــــ ان کی آواز میں کچھ خاص طرح کا لوں تھا ـــــ دریا کے پانی جیسا، ہلکا سا ہوتے ہوئے بھی بڑا بھاری اور اپنے زور سے بہتا ہوا۔ کوئی پتھر، کنکر، پتہ یا ہاتھوں کی کثافت اس میں ڈال دو تو اس سے بے نیاز، اس کو بہالے جاتا یا پاؤں میں پھینک کر اس کے اوپر سے گذر جاتا۔ ان کی آواز ایک سمت میں بہتی چلی جاتی، اطراف کی باتوں کو سن کر کبھی ٹھہرتی معلوم نہیں تھی ہوتی۔ سادھوؤں کے ڈیرے بھی خانہ داروں کی مانند جھگڑوں، تصادموں اور غیبتوں وغیرہ سے رستے بستے ہیں ـــــ جالے ان کے کونوں میں بھی لگتے ہیں لیکن ان کی آواز دریا کی روانی کی مانند اس سب کچھ کو بہالے جاتی اور ان کو آنکھ بھر کر دیکھتی بھی نہ تھی۔ یہ آواز دو طرح کی تھی ـــــ ایک بھاری، وزنی اور تیز رفتار، دوسری ـــــ بہت نازک، اداس اور ہوا کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتی ہوئی۔ ۔ ۔

اور ناول میں مہنت کرپا ساگر جس ایک جملے کو بار بار دوہراتے ہیں، یاد آیا کہ وہی جملے میرے والد کے ہونٹوں پر ہوا کرتے تھے ـــــ "مدتیں گذر گئیں بے یار و مددگار ہوئے۔ ۔ ۔"

مہنت کرپا ساگر کی کہانی کا کچھ حصہ میں نے شعوری طور پر اپنے والد کے ایک دوست سادھو کی زندگی سے لیا تھا۔ لیکن جب مہنت کرپا ساگر کے مزاج کا ذکر کیا تو غیر شعوری طور سے مجھ سے اپنے والد کے مزاج کا ذکر ہو گیا۔

۱۵ مئی ۱۹۷۳ء کو جب دہلی یونیورسٹی نے آنریری ڈی، لٹ کی ڈگری عطا کی، گھر آ کر نے پروبیندر نے اپنی جیب میں کچھ چھپا کر کہا ـــــ "دیدی! آج کوئی من آئی کرنے کو جی چاہتا ہے، ناراض نہ ہونا!" جواب میں ہنس پڑی تھی ـــــ "بے، تیری من آئی جو بھی ہوگی، اچھی ہوگی ـــــ" اور دیبیندر نے جیب سے ایک ریشمی رومال، مصری اور اکیس روپے نکال کر کہا "دیدی! آپ کا کوئی بابھائی ہوتا، کوئی شگن کرتا۔ ۔ ۔ یہ شگن ان کی طرف سے۔ ۔ ۔ ۔"

آنکھیں بھر بھر آئیں، اور یاد آیا "ایک سوال" ناول میں جب ناول کا ہیرو اپنے باپ کی موت

کے بعد، اپنی بھرپور جوان، سوتیلی ماں کی اپنے ہاتھ سے اس کی من چاہی شادی کرتا ہے، اور وہ پرشباب لڑکی تھالی میں بدلی ڈ پروس کر کہتی ہے ــــ "آؤ، ماں بیٹا مل کر کھائیں!" تو وہ روٹی کا پہلا لقمہ توڑتے ہوئے کہتا ہے ــــ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم میری ماں لگتی ہوں، بہن لگتی ہو یا میری بیٹی لگتی ہو؟" ــــ

تب ناول کا یہ حصہ لکھتے ہوئے دیویندر میرے سامنے نہیں تھا۔ لیکن چودہ سال بعد جب دیویندر نے وہ رومال، وہ مصری اور دس روپے میری جھولی میں ڈالے تو میرے دل میں آیا بل بعینہٖ وہی تھا ــــ "بے، پہلے یہ بتا، تو میرا باپ لگتا ہے میرا بھائی کہ میرا بیٹا؟"

ایک افسانہ "پگھلتی چٹان" میں نے ۱۹۷۴ء کے آغاز میں لکھا تھا۔ بالکل نہیں جانتی کہ میرے لاشعور کا یہ کون سا منظر تھا۔ میں نے اس کا پس منظر نیپال کے سؤیمبھو پہاڑ کی چوٹی پر بنا ایک مندر رکھا جہاں ایک نوجوان دوشیزہ راج شری آخرِ شب کو جاتی ہے اور وہاں پہنچ کر دوسری جانب کی ڈھلان اترتی اس باگمتی دریا کا راستہ پہچانتی ہے، جس دریا میں کبھی دو صدیاں قبل اسکے خاندان کی ایک دوشیزہ نے زندگی سے نجات کی راہ پائی تھی۔ راج شری، محبت کی ناکامی اور یاس میں وہی راستہ منتخب کرتی ہے جو کبھی اس کے خاندان کی ایک دوشیزہ نے انتخاب کیا تھا۔ ساتھ ہی سوچتی بھی ہے ــــ پاؤں کے لیے ایک ہی راستہ کیوں بنا؟ کہانی آگے بڑھتی ہے تو راج شری کے دل میں عظیم انقلاب آتا ہے۔ وہ خود کو پہچانتی ہے، جان لیتی ہے کہ ایک وقت کا سچ ہر زمانے کا سچ نہیں ہوتا . . . . اور وہ موت کی ڈھلان کی جانب سے قدم موڑ کر زندگی کی بلندیوں کے راستہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔

پورے دو سال بیت گئے۔ اس کہانی کے کردار کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی ملا کر نہیں دیکھا تھا کہ ایک رات نیم خوابی کی سی حالت میں میری زندگی کا وقت قریب پینتیس[۳۵] سال پیچھے چلا گیا، اور دیکھا ابھی مشکل سے قریب بیس برس کی ہوں۔ گوجرانوالہ گئی ہوں، اسی گلی میں، اسی گھر میں جہاں کبھی میرے والد کی بہن، ہاکو تہ خانہ میں بند چلہ کاٹتے مر گئی تھی . . . . .

کانوں میں وہی مانوس آواز پڑی، پینتیس سال پہلے کی، جب مجھے دیکھ کر گلی کی جیوی بھگتنی پہلے مجھے دیکھتی رہ گئی تھی، پھر اپنے حیران ہوتے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بول اٹھی تھی ــــ "ہائے میں مر گئی، بالکل ہاکو . . . . . بالکل وہی . . . .

میری بوا ہاکو کے زمانہ کی اس گلی میں ایک ہی عورت تھی جو ابھی بھی جیتی تھی۔ اس نے یوں کہا ــــ تو میں نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھ کر پہلی بار ہاکو کے خدوخال کو تصور میں

یاد کیا... گو اپنی خالہ کی صورت کے ساتھ میری صورت کی مشابہت معمولی واقعہ ہو سکتا تھا، لیکن یوں لگا ـــــــ یہ قدرت کا کوئی راز ہے، شائد کسی ہونہار کا اشارہ... میں اس وقت دل کی گہری پریشانی میں سے گذر رہی تھی، شادی ہو چکی تھی لیکن دل اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اپنے چہرے کے خدوخال میں ہاکو کا پرتو دیکھا تو آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ یوں لگا، ہاکو کا انجام ہی میرا انجام ہے........

وہی دن تھے ـــــــ جب میں نے مرنا نہیں، زندہ رہنا چاہا۔ تڑپ کر سوچا ــــ "پاؤں کے لیے یہ ایک ہی راستہ کیوں بنا؟" اور تڑپ کر عزم کیا ـــــــ "میں ہاکو کی مانند مروں گی نہیں.... جیونگی!"......

جنموں کی بات نہیں جانتی۔ لیکن سوچا، جیوی بھگتنی کے کہنے کے مطابق اگر یہ سچ بھی ہے کہ پچھلے جنم میں، میں ہی ہاکو تھی، تو بھی اس جنم میں اس کی مانند نہیں مرونگی......

لیکن یہ اپنی آپ بیتی، مجھے ۱۹۷۴ میں یہ کہانی "پگھلتی چٹان" لکھتے وقت شعوری طور پہ بالکل یاد نہیں تھی۔ میرا لاشعور، معلوم نہیں کس وقت ابھر آکر یہ کہانی لکھوا گیا، اور پھر میری نظروں سے بھی اپنے بدن کو چراتا دل کی عمیق تہوں میں اتر کر گم ہو گیا...

کئی واقعات بہ مشکل کچھ دنوں کے فاصلہ پر کسی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں، لیکن کئیوں کو قلم تک رسائی پانے کے لیے سال چیرنے پڑتے ہیں۔ پہلی طرح کے واقعات میں سے ایک مجھے یاد ہے، جب میں ۱۹۷۰ء میں نیپال گئی تھی۔ قریب پانچ دن، روز شام کے وقت کسی نہ کسی نشست گاہ میں مشاعرہ ہوتا رہا جہاں کچھ نیپالی شاعر روزانہ ملتے تھے۔ ان میں ایک شاعر تھا، ادھیڑ عمر کا تاہم بڑا سنجیدہ مزاج۔ میں نے صرف اتنا جانا تھا کہ وہ روز دبے لہجے میں میری ایک خاص نظم کی فرمائش ضرور کرتا تھا۔ بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن جس روز واپس دہلی لوٹنا تھا، اور کئیوں کے ساتھ وہ بھی ائیرپورٹ پر آیا تھا۔ اور عجیب سبب تھا کہ اس روز پلین ایک گھنٹہ لیٹ تھا۔ انتظار کا سارا وقت، اس نے میرا بھاری، گرم کوٹ اٹھائے رکھا۔ پھر پلین کے آنے پر جب میں اس سے کوٹ پکڑنے لگی، اس نے ہولے سے کہا ـــــ "یہ جو بار دکھائی دیتا ہے، یہ تو آپ لے لیجیے، جو نہیں دکھائی دیتا، وہ میں لیے رہوں گا...." اور میں بس چونک گئی تھی۔ واپس دہلی آکر ایک کہانی لکھی ـــــ "ہنگارہ" ـــــ اس کے متعلق نہیں، تاہم یہ فقرہ زبردستی اس میں آ گیا۔

اور دوسری طرح کی بات، جو قلم تک پہنچتے برسوں لگا دیتی ہے، اس کی ایک مثال میری وہ کہانی "دو عورتیں" ہے جس میں ایک عورت شاہنی ہے اور دوسری شاہ کی داشتہ طوائف۔ یہ کہانی میں نے لاہور میں آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتی دیکھی تھی۔ ایک امیر گھرانے میں بیٹے کی شادی تھی اور گانا بجانا چل رہا تھا۔ اس گھرانے کے ساتھ معمولی سی واقفیت تھی، تاہم میں بھی اس وقت وہیں تھی جب پتہ لگا کہ آج لاہور کی مشہور گانے والی طمنچہ جان وہاں آ رہی ہے۔ وہ آئی ـــــ بڑی چھبیلی تھی، اور ناز و نخرے کے ساتھ وارد ہوئی۔ اس کو دیکھ کر ایک بار تو گھر کی مالکن کا رنگ ذرا پیلا ہو گیا۔ تاہم آخر وہ بیٹے کی ماں تھی۔ طمنچہ جان جب گا چکی تو شاہنی نے سو کا نوٹ نکال کے اس کی جھولی میں خیرات کی طرح ڈال دیا۔ اس وقت ناز و ادا والی کی ناک نیچی ہو گئی۔ تاہم اس نے گویا اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے عورتوں کے بھاری اجتماع میں کہہ دیا "رہنے دے شاہنی! پہلے ہم تو تیرے گھر کا ہی کھاتی ہوں!" اور یوں شاہ کے ساتھ رشتہ جوڑ کر جیسے اس نے شاہنی کی تذلیل ست کر دی۔ دیکھا، شاہنی بھرے اجتماع میں ایک بار پھیکی پڑ گئی، لیکن پھر فوراً سنبھلی اور بے پروائی سے نوٹ لوٹاتی ہوئی کہنے لگی ـــــ "اری، شاہ سے تو تو روز لیتی ہے، مجھ سے کب کب لینا ہے!"

یہ دو عورتوں کا عجیب ٹکراؤ تھا جس کے پس منظر میں سماجی اقدار تھیں۔ طمنچہ گو جوان تھی، چھبیلی تھی، فنکار تھی، اور مقابلہ میں شاہنی موٹی، بھدی اور ڈھلتی عمر کی، جو ہر لحاظ سے اس پہلی کے سامنے ہیچ تھی، لیکن اس کے پاس بیوی اور ماں ہونے کا جو تفاخر تھا، وہ بازار کے حسن پر غالب تھا۔ . . . لیکن یہ کہانی میں پورے پچیس سال بعد لکھ سکی!

۱۹۷۵ء میں میرے ناول "دھرتی، ساگر اور سیپیاں" کی بنیاد پر جب کادمبری فلم بن رہی تھی تو اس کے ڈائرکٹر نے مجھے فلم کا ایک گیت لکھنے کے لیے کہا۔ سچویشن وہ بتائی، جب چیتنا، سماجی منظوری کے خیال کو ہاتھ سے پرے کر کے اپنے محبوب کو اپنے دل اور جسم میں حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس وصل اور سوز کے مقام اتصال پر کھڑی چیتنا کو سامنے رکھ کر میں جب گیت لکھنے لگی تو اچانک وہ گیت سامنے آ گیا جو میں نے ۱۹۶۰ء میں امروز سے پہلے ملن کے موقعہ پر اپنے دل کی حالت کے بارے میں لکھا تھا۔ جو اذیت میں نے اپنے دل پر جھیلی تھی، محسوس ہوا کہ وہی اب چیتنا نے جھیلی ہے۔ اور اس گیت سے زیادہ پر اثر اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے پنجابی گیت کو ہندی میں پلٹنا شروع کیا اور محسوس ہوا گویا

چیتنا کی صورت میں میں ۱۵ برس پہلے کا وہ لمحہ پھر سے جی رہی ہوں ——

آج ہم نے ایک دنیا بیچی
اور ایک دین خرید لانے ، بات کفر کی کی
سپنے کا ایک تھان بُنوایا
مگر پھر کپڑا پھاڑ لیا ، اور عمر کی چولی سی لی
آج ہم نے آسمان کے گھڑے پر سے
بادل کی ایک چپنی اتاری ، گھونٹ بھر چاندنی پی لی
گیتوں کے ساتھ چکا جائیں گے ۔
یہ جو ہم نے موت سے گھڑی ادھار لی ہے . . . .

"بینا" میرے ناول "آلنا" (گھونسلہ) کا خیالی کردار تھا ۔ لیکن اس کو لکھتے ہوئے اس کے خدوخال میرے دل میں یوں نمایاں ہو گئے تھے کہ ایک رات وہ میرے خواب میں آئی ، بڑے غصہ و غضب میں بھری ۔ پہلے وہ چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی ، پھر تڑپ کر کہنے لگی ——" تم نے میری کہانی اتنی المیہ کیوں بنائی ؟ کیوں ؟ اگر میں زندہ رہتی تو تمہارا کیا حرج ہو جاتا ؟ تم نے مجھے کیوں مار ڈالا ؟ کیوں ! میں زندہ رہنا چاہتی تھی . . . ."

ناول میں ایک مقام پر بینا کہتی ہے ——" میری ماں بھی سکھی نہ ہو سکی ۔ وہ شاید میں ہی تھی ، پہلے جنم میں ' . . . اور اب میں پھر سکھی نہ ہو سکی ، دوسرے جنم میں ' . . . . شاید اپنی بیٹی کے جامہ میں سکھی ہو سکوں گی تیسرے جنم میں . . . ." یہ جنموں کی بات میں نے آواگون کے کسی اعتقاد میں سے نہیں لکھی تھی ، صرف تین نسلوں کی بات کو علامت کے طور پر لیا تھا ۔ لیکن اس بات نے میری ناظرین لڑکیوں میں سے ایک کے دل میں اس قدر گہرا اثر پیدا کیا کہ اس نے اپنے آپ کو بینا سمجھ لیا اور یہ یقین کر لیا کہ وہ مر کر تیسرے جنم میں پڑے گی تب سکھی ہو گی . . . .

اس نے مجھ کو کچھ خط تحریر کیے لیکن بغیر اپنا نام اور پتہ بتائے کے ۔ صرف اسی قدر لکھتی ——" میں تمہارے ناول کی بینا ہوں ——" میں اس کو اس وہم سے نکالنا چاہتی تھی کہ وہ اس کہانی میں اپنی تقدیر کا عکس نہ دیکھے ، لیکن کمبخت نے کبھی بھی مجھے اپنا پتہ نہیں بتایا ۔ مجھے نہیں معلوم ، اس کے ساتھ پھر زندگی میں کیا پیش آیا . . . .

اسی طرح ناولوں، افسانوں کے کئی کردار ناظرین کے لیے اس قدر زندہ اور حقیقی بن جاتے ہیں کہ وہ خطوں میں مجھے لکھتے ہیں ـــــ وہ اپنا، وہ انکا، وہ اپنا جہاں کہیں بھی ہے، اس کو پیار بھیجئے گا۔ ۔ ۔ ۔

"ایک تھی انیتا" ناول جب اردو میں شائع ہوا، تو حیدرآباد سے ایک چھلے میں رہنے والی ایک عورت نے مجھ کو خط لکھا کہ یہ علین اس کی کہانی ہے۔ اس کی روح بھی اسی طرح پاکیزہ ہے، اس کی جستجو بھی وہی ہے، صرف حادثے مختلف ہیں۔ اور اس نے اپنا نام و پتہ بتلا کر لکھا کہ اگر میں اس کی کہانی لکھنا چاہوں تو وہ کچھ روز ۔۔ کے لیے دہلی آ سکتی ہے۔ میں نے اس کو خط لکھا لیکن اس کے بعد کبھی اس کا مکتوب نہیں آیا۔ معلوم نہیں، اس اتنی حساس عورت کا کیا بنا۔ ۔ ۔ ۔

ہاں: "اپریل" ناولٹ کی ہیروئن میرے پاس آ کر قریب ڈیڑھ ماہ میرے گھر رہی تھی کہ میں اس کی زندگی پر کچھ لکھ سکوں۔ ناولٹ لکھ کر پہلے اسی کو سنایا تھا۔ اس ریڈنگ کے دوران اس کی آنکھوں میں کئی بار تسلی کے آنسو آئے۔ اس طرح اگر کسی ہستی خاص کے اوپر کوئی کہانی یا ناول لکھوں تو اس کردار کی تسلی میرے لیے کہانی شائع ہونے سے کہیں زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ تصنیف انسانی زندگی کے مطالعہ کے لیے ہے نہ کہ کچھ لوگوں کا دل دکھانے کے لیے، یا ان کے بارہ میں چونکا دینے افواہیں پھیلانے کے لیے، جیسا کہ ہمارے کچھ پنجابی ادیب کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

"بلاوا" ناولٹ میں نے بمبئی کے مشہور و معروف آرٹسٹ، فیض کی زندگی پر لکھا تھا۔ انہوں نے ریس کے گھوڑوں پر صرف پیسہ نہیں لگایا، اپنی ساری زندگی لگادی ہے۔ ان کا فن اور ان کا یہ مہلک شوق دونوں مخالف سمتیں ہیں۔ اسی کھینچ تان میں پڑے ہوئے ان کی زندگی کے آوارہ سال لکھنے کی میں نے سعی کی تھی۔ لیکن لکھنے کے بعد، سب سے پہلے یہ ناولٹ ان کو سنایا، اور ان کی اجازت لے کر پریس میں دیا۔

اس طرح کئی کہانیاں ہیں ـــــ ایک کسی ملک کے سفیر کی بڑی پیاری اور اداس بیوی پر لکھی تھی، جو اس کے پڑھنے کی خاطر پہلے انگریزی میں ترجمہ کرائی اور پھر اس کی اجازت سے کر پریس میں دی۔ دو تین کہانیاں میں نے اپنی ایک بڑی عزیز دوست عورت کی زندگی پر لکھیں، اس کی زندگی کے بڑے نازک اور سوز بھرے لمحوں کے بارہ میں۔ لیکن چھاپنے سے قبل اس کو

سنائیں، اور اس کے کہنے پر شہروں اور کرداروں کے نام بھی تبدیل کیے تاکہ کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی پہچان نہ سکے۔

ایک کہانی غیر ملکی عورت پر بھی لکھی تھی جس میں کہانی کا انجام تبدیل کرنا پڑا تھا۔ کہانی میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ لیکن برسوں بعد میں اس کے ملک میں گئی تو وہ گرم جوشی سے گلے لگ کر ملی۔ اس کے پہلے لفظ تھے ——— "دیکھو، میں ابھی زندہ ہوں۔ کہانی کی موت میں سے گذر کر بھی زندہ ہوں!" اور اس روز ہم دونوں نے مل کر تصویریں کھینچوائیں۔ اس نے میرے لیے کئی سوغاتیں خریدیں.....

سچ، میرے کردار اور ان کی میرے لیے محبت میری اصل امیری ہے۔ میں نہیں جانتی ——— وہ ادیب جو اپنے کرداروں کے دلوں کو ٹھیس پہنچا کر افسانے گھڑتے ہیں، ان کو زندگی میں کیا حاصل ہوتا ہے!

ناول "جیب کترے" لکھ رہی تھی تو اس میں جیل کے اندر بند ایک کردار تنویر ایک نظم لکھ کر کسی طور باہر بھجواتا ہے، اور نظم کے نیچے اپنے نام کی جگہ قیدی نمبر لکھتا ہے ——— ۹ - ۸۹ میں نے یہ نمبر غیر شعوری طور لکھ لیا تو یاد آیا کہ یہ نمبر گورکی کا قیدی نمبر تھا جو میں نے ماسکو میں اس کے یادگاری گھر کو دیکھتے ہوئے کبھی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔ پھر آگے ناول کی کہانی میں میں نے اس کو شعوری طور سے استعمال کر لیا....

ہاں، اس طرح کبھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ شعوری اور لاشعوری تحریریں ——— کب کہاں گھل مل جاتی ہیں....

ناول "جیب کترے" میں نے اپنے جوان ہوتے بیٹے کی زندگی کو پیش نظر رکھ کر لکھا تھا، اس سے پیشتر ایک کہانی لکھی تھی... کہانی در کہانی ——— جس کا واقعہ یہ تھا کہ ایک بار چھٹیوں میں ہوسٹل سے گھر آئے میرے بیٹے نے اپنی ایک بنگالی گرل فرینڈ کو خط لکھا، بڑا جذباتی ڈوب کر، کہ اس وقت میرے کمرے میں بیتھوون کا نغمہ ہے اور میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن تم کو خط لکھنا یوں ہے گویا کوئی اپنے ہی گھر کے دروازے پر دستک دے رہا ہو.....

جواب میں اس لڑکی کا جو خط آیا، وہ بے حد عامیانہ تھا۔ گرمی کی شام تھی جس وقت ایک کاغذ تھامے وہ میرے کمرے آیا۔ اس وقت تک نہ مجھے اس خط کا حال معلوم تھا جو اس نے تحریر کیا تھا، اور نہ اس کا، جو جواب میں آیا تھا۔ اس نے بتایا ——— ماما! میں نے ایک لڑکی کو ایک خط

لکھا تھا۔ لیکن وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آپ کو سناؤں؟ اور اس نے مجھے خط سنایا۔ خط کی ناصاف نقل اس کے پاس تھی۔ اور کہنے لگا۔ جواب میں جو خط آیا ہے، وہ یوں ہے گویا موسم کا حال بتایا ہو..... میں نے پوچھا ——— اب اس کو اور خط لکھنا چاہو گے؟ تو وہ کہنے لگا ——— نہیں اس کا خط اس قدر معمولی ہے، پڑھ کر لگتا ہے ——— جیسے میں اگلے دروازے سے اندر داخل ہوا ہوؤں اور عقبی دروازے سے باہر آگیا ہوؤں!" اور میں نے کچھ دن بعد اس چھوٹی سی بات کو لے کر کہانی لکھی تھی۔ لیکن اب جس وقت ناول لکھا تو اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس میں یونیورسٹی کے ہوسٹل کا جو ماحول ہے، وہ میرے اپنے لڑکے کے دوست میں، جوان ہوتے بیٹوں کے ساتھ جوڑ سکتے..... ، بھوک، خوف اور ذلت کے ساتھ فلرٹ کرتے ——— زندگی کو اپنے اپنے نظریے سے دیکھتے اور اپنے اپنے تجربے کے درد کو برداشت کرتے....

بنیادی واقعات و حادثات میرے بیٹے کی، اور اس کے دوستوں کی زندگی کے ہیں، لیکن یہ اپنے سے اگلی نسل کو سمجھنے کی سعی تھی۔ اس میں میں نے اپنے آپ کو گو تماشائی کی حیثیت سے رکھا ہے، تاہم میری غیر شعوری اور غیر ارادی طور سے اس کے کئی خیالوں میں سما جانا قدرتی تھا۔ یہ جب میں نے لکھ کر اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے دیا، اور گو اس سے بھی پہلے اس کے دوستوں نے پڑھا ——— اپنا اپنا چہرہ پہچانتے رہے اور مجھے کمپلیمنٹ دیتے رہے۔ لیکن جب میرے لڑکے نے پڑھا، کئی مقامات اور مواقع پر بخوبی لکھ سکنے کا کمپلیمنٹ بھی دیا، لیکن کہا ——— "یہ ناول اگر میں خود لکھتا، کچھ اور طرح لکھتا!" یہ صحیح ہے ——— آخر میرے بیٹے پر بھی ایک نسل کے فاصلے کو طے کرنے کی سعی تھی۔ لیکن فاصلے کو طے کرتے پاؤں اپنے تھے، پہلی نسل کے۔ اس لیے میرے وقت کے آئیڈیلزم کا اس میں آمیز ہو جانا قدرتی تھا....

اس ناول میں کے جس سونا اور رومی کی شادی میں نے بہ تفصیل لکھی ہے، وہ ناول چھپنے کے کئی عرصہ بعد میرے لڑکے کو ملنے آئے، مجھے ملے تھے۔ وہ کتاب میں درج اپنے بیاہ کی تفصیل کو پڑھ کر ہنستے رہے اور میں اپنے کرداروں کو دیکھتی رہی.... اب ان کا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے، ان کے گھر اگے ہوئے بیاہ کی تصدیق.....

خیر! اپنے کرداروں کو اس طرح دیکھنا، جو ایک پیارا تجربہ ہے، وہ علیحدہ بات ہے۔ میں ناول کے زمانۂ تصنیف کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کا خیال ایک اس خط سے بندھا تھا جو میرے لڑکے نے مجھے ہوسٹل سے تحریر کیا تھا۔ ناول میں یہ خط پانچویں باب کے آغاز میں ہے جس میں ناول کا ہیرو کپل خط کو اخبار کی شکل دیتا ہے، اس کا نام "ٹائمز آف کپل" رکھتا ہے، اور اخبار کے جاری ہونے کی تاریخ وہ لکھتا ہے جو اس کی اپنی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اور اس اخبار کی بکری سب سے زیادہ جس شہر میں ہوتی ہے، وہاں اپنی ماں کا ایڈیشن لکھتا ہے پھر اخبار کے چھ کالم بناتا ہے ——— جن میں خبروں کی شکل میں ماں کو خط لکھتا ہے۔ . . . میرے لڑکے کا نام نوراج ہے، لیکن اس کو پیار سے سیلی بھی پکارتے ہیں، میرے پاس اس کا خط "ٹائمز آف سیلی" ابھی تک رکھا ہوا ہے . . . .

وہ ہوسٹل سے جب چھٹیوں میں گھر آتا تھا۔ تو ہوسٹل کی کئی باتیں بہ تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس خط کے بعد جب آیا تو میں نے ناول شروع کرنے سے پیشتر اس کو پاس بٹھا کر نوٹس لینے شروع کیے . . . . پھر جب ناول شروع کیا تو ایک بار اس نے کہا "ماما! آپ نے اپنی زندگی کو شاہ موڑ دیا، لیکن آپ کو معلوم ہے؟ ہم دونوں بچوں نے اس کے لیے کتنی ذہنی اذیت برداشت کی ہے؟"

گھر ٹوٹتا ہے تو معصوم بچے ٹوٹتے ہوئے گھر کے کنکر کس طرح بدن پر برداشت کرتے ہیں، اس کا درد میرے دل میں تھا۔ کہا ——— "جس طرح غریب ماں کے گھر پیدا ہوئے بچوں کو ماں کی غریبی بھگتنا پڑتی ہے، اسی طرح دل کے درد و سوز میں سے گذرتی ہوں ماں کے گھر پیدا ہوئے بچوں کو اس کے درد و سوز کو بھی بھگتنا پڑتا ہے ——— ماں کے خدوخال کی طرح . . . ."

جانتی ہوں، اس سوز و گداز کو میرے بچوں نے جھیلا ہے، لیکن میری بیٹی نے سارے عرصے کی طوالت میں کبھی بھی میرے ساتھ ہمدردی نہیں گنوائی تھی، لیکن بیٹے نے کچھ عرصہ کے لیے ضرور گنوائی تھی، بچپن سے شباب میں قدم رکھنے کے درمیانی وقفہ میں! یہ شاید ایک لڑکا اور لڑکی ہونے کا فرق تھا۔ آج بھی میری ننھی سی، انجان سی بیٹی کے وہ بول میرے کانوں میں ہیں۔ جب نوراج کی کسی کسی وقت کی بے رخی سے اداس ہو جاتی تھی تو کہا کرتی تھی ——— "ماما! آپ زیادہ غور و فکر نہ کیا کریں۔ سیلی بڑا ہو جائے گا تو آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا!"

خیر، اس دن میرے بیٹے نے کہا "ماما! اس ناول میں آپ اس بچے کی وہ پریشانی لکھ سکتی ہیں جس میں سے ماں باپ کا گھر بکھرنے پر وہ گزرتا ہے؟"

"ہاں، پوری جرأت کے ساتھ!" میں نے کہا، اور ناول کے آخری حصے میں کپل کے "ہڈ نارمل ورژن" کی صورت میں اس پریشانی کو لکھنے کی سعی کی ۔۔۔۔

میرے ناول کو صرف انھوں نے صدمہ دیا ہے جن کا میری زندگی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ان کے ساتھ صرف ایک ہی پیشے کا واسطہ ہے کہ میں ان کی ہم عصر ادیب ہوں ۔ یہ صدمے بانٹنے والے نہ میرے پڑھنے والے تھے، اور نہ وہ جنھوں نے اس درد میں سے اپنی مٹھی بھری ہے،

کنول نے جس کے ساتھ شادی کی ہے، وہ مجھے ڈیڈی ماں، کہہ کر پکارتا ہے ۔ اور اس کے دل کا پہلا فیصلہ تھا کہ وہ شادی کے موقع پر دور و نزدیک کے لوگوں کی بارات نہیں باندھے گا اور نہ کسی بے تکی کے لیے کسی کو کوئی موقع دے گا ۔ شادی کی پیشکش کے وقت کا اس کا ایک پیارا سا جملہ مجھے ابھی بھی یاد ہے ـــــ میرے سرہانے کے پاس ایک ہومیوپیتھک دوائی کی شیشی رکھی تھی، اس نے اس کی دو چار میٹھی سی گولیاں نکال کر کھاتے ہوئے کہا "بس! مونہہ میٹھا ہو گیا، شگن ہو گیا" ـــــ اور اس طرح اس نے اپنے اور میرے دل کی، ہاں، کا جشن منا لیا ۔ شادی کا دن کنول کا روزِ پیدائش منتخب کیا، ۲۳ ۔ اپریل، اور اس کے کیک پر لکھا ۔ "اے ڈیٹ ود لائف" اور عدالت میں جانے کے بجائے مجسٹریٹ کو گھر بلا کر شادی کا سرٹیفکیٹ لے لیا ۔

میرے لڑکے نے ایک گجراتی دوشیزہ کے ساتھ شادی کی ہے ۔ یونیورسٹی سے وہ آرکیٹیکچر کی ڈگری اور اپنی دلہن، دونوں چیزیں گویا اکٹھی لایا تھا ۔ شادی سے قبل وہ دونوں دوست تھے اور صرف دوست رہنے کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا ۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ اس کے گجراتی والدین کبھی بھی اس کو کسی پنجابی نوجوان کے ساتھ شادی نہیں کرنے دیں گے ۔ اور میرے لڑکے کا یقین تھا "اگر میں فیصلہ کروں بیاہ کرنے کا، تو لڑکی ضرور کرے گی، لیکن کروں گا نہیں ۔ اس کے والدین بہت ہی امیر ہیں اور میں بہت امیر لڑکی کے ساتھ بیاہ نہیں کرنا چاہتا ۔" اور وہ دونو صرف دوستی کا استحقاق رکھتے رہے ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لڑکی کا باپ فوت ہو گیا اور اس کے چچاؤں کا سلوک اس قدر بدل گیا کہ لڑکی اپنے مستقبل سے گھبرا گئی ۔ کہنے لگی "میں نے زندگی میں ایک ہی مخلص دوست پایا ہے،

اس کو گھر کی کون سی مریادا کے لیے چھوڑ دوں ؟" — اور اس نے ہوسٹل سے دو دن کے لیے دہلی آ کر مجھ سے کہا کہ آپنے ہاتھ سے میری شادی کر دیجئے۔

میرے بیٹے کے بھی یہ الفاظ تھے — "ماما! اگر یہ لڑکی میری زندگی میں سے چلی گئی تو ساری زندگی میرے دل میں اس کی یاد رہ جائے گی"

سوچتی ہوں — اس کی یہ محبت بھی ایک وہ حادثہ ہے جو زندگی کی الجھنوں کو سمجھنے میں اس کا مددگار ہوا ہے اور اس کے نقطۂ نظر کو بڑا وسیع کر گیا ہے۔

شادی کی رسم کرنا تھی، کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ میرے بیٹے گوردگرنتھ صاحب کی موجودگی بھی آتنی ہی پاکیزہ تھی جتنی ہون کی آگ۔ یہ تو اصل میں سالم دل کی حاضری ہوتی ہے۔ میرے لڑکے نے کہا کہ اس کو ہون کی آگ خوبصورت لگتی ہے۔ سو یہی سہی۔

دوپہر کے وقت لڑکے کو جب شادی کی نشانی دینے کے لیے ایک انگوٹھی خرید کر دی تو اس گجراتی بیٹی نے کہا — "ماما! میں نے بھی تو اس کو انگوٹھی دینا ہے —" سو میں اس کی بھی ماں تھی، اور اس کے لیے بھی وہ انگوٹھی خرید کی، جو اس نے میرے بیٹے کی انگلی میں پہنانا تھی۔

ہون کے وقت جیوتی کے کسی بزرگ کی ضرورت تھی جو کنیا دان کرتا۔ اور پنڈت نے جب پتا کی حاضری چاہی تو امروز نے کہا — "میں کنیا کا پتا ہوں، کنیا دان کرتا ہوں...."

اور نوراج اور جیوتی کی شادی ہوئی اپنی قسم کی صرف آپ! قریب چھ ماہ گجراتی والدین کی طرف سے خاموشی رہی۔ پھر لندن سے بھائی کا فون آیا، بہن کا ماں کا ماموں قریب سال بھر بعد لڑکی ولایت جا کر سب سے مل آئی۔ دو سال بعد ماں ہندوستان آئی۔ اپنی بیٹی کے سکھ سے وہ سچ مچ سکھی تھی۔ قریب پندرہ دن پاس رہے۔ ساتھ میں بھائی بھی تھا، جس نے بہن کے من چاہے خاوند کو پہلی مرتبہ دیکھا، اور اس کا اچھا دوست بن گیا۔

یہ کتابوں کے نہیں، زندگی کے ورق ہیں، لیکن ان کی عبارت صرف ان کی سمجھ میں آتی ہے، جنہوں نے زندگی کے گھوسے اپنے بدن پر جھیلے ہیں، اور جو ہاتھوں کی تونت صرف اپنے دلوں سے لیتے ہیں۔

آج کل باسو بھٹاچاریہ میرے اور امروز کے بڑے پیارے دوست ہیں۔ وہ جب

انتہائی افلاس میں سے گذر رہے تھے، جب انہوں نے اپنی زندگی کی ایک حسین حقیقت گھر میں بٹھائی ہوئی تھی، اپنی بیوی رنگی، فلمی دنیا کے بہت بڑے پروڈیوسر کمل راسنے کی بیٹی تھی کو وہ بغاوت کے زور سے اپنی بیوی بنا کر گھر لے آئے تھے، اور دروازے سے باہر، دہلیزوں سے پرے، عزبی کو بٹھایا ہوا تھا۔ ان دنوں کی بات سناتے وہ کہتے ہیں :
عزبی تھی، لیکن میں اسے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا، وہ باہر بیٹھی رہی۔ گھر میرا تھا، میں اندر بلاتا تب وہ آتی نا! یونہی کیسے چلی آتی!" سوچتی ہوں ـــــ آج یہ جو کچھ اپنے دل کے عمیق ترین گوشوں سے نکال کر کاغذوں کے اوپر رکھ رہی ہوں، یہ صرف ان کے لیے ہے جو دنیا کی روایتوں اور دشواریوں اور اداسیوں کو دروازے سے باہر بٹھا کر، دل کے سچ کو اندر بیٹھا کر جینے کا حوصلہ کر سکتے ہیں. . . .

تخیل کا جادو

زندگی میں ایک اس طرح کا وقت بھی آیا تھا ـــــ جب اپنے ہر خیال پر میں نے اپنے تخیل کا جادو چڑھتے دیکھا تھا. . . . جادو لفظ صرف بچپن کی کہانیوں میں کبھی سنا تھا، نہیں دیکھا ـــ ایک دن اچانک وہ میری کوکھ میں آگیا تھا اور میرے ہی جسم کے گوشت کی آڑ میں پلنے لگ پڑا تھا. . . . یہاں دنوں کی بات ہے، جب میرا بیٹا میرے جسم کی امید بنا تھا ۱۹۴۶ کے آخری دنوں کی بات۔

اخباروں اور کتابوں میں کئی وہ حادثے پڑھے تھے ـــ کہ ایک ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں ہوں، یا جس قسم کی صورت وہ دل میں لا دے، بچے کے خط و خال ویسے ہی بن جاتے ہیں. . . . اور میرے تخیل نے جیسے دنیا سے چھپ کر دبے لہجے میں میرے کانوں میں کہا ـــــ اگر میں ساحر کا چہرہ ہر وقت اپنی یادوں کے سامنے رکھوں، تو میرے بچے کی صورت اس کے مشابہ ہو جائے گی. . . .

جو زندگی میں نہیں پایا تھا، جانتی ہوں، یہ اسی کو پا لینے کی کرشمے ایسی سعی تھی. . . خدا کی طرح پیدائش دینے کی سعی. . . . جسم کا ایک آزاد فعل. . . . صرف فطری میلانات سے آزاد نہیں، گوشت و خون کی حقیقت سے بھی آزاد. . . .

سنک اور دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ جولائی ۱۹۴۷ کو پیدائش عمل میں آئی، اول

مزید اس کا نمونہ دیکھا، اپنے خدا ہونے کا یقین آگیا ۔ ۔ ۔ اور بچے کے چہرے کی نشوونما کے ساتھ یہ خیال بھی نشوونما پاتا رہا کہ اس کی صورت واقعی ہی ساحر سے مشابہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔

خیر! دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑے نہیں رہا جا سکتا ۔ پاؤں کو بیٹھنے کے لیے زمین کا قطعہ چاہیئے، اس لیے آئندہ برسوں میں میں اس کا تذکرہ ایک پری کہانی کی طرح کرنے لگ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار یہ بات میں نے ساحر کو بھی سنائی، اپنے آپ پر ہنستے ہوئے ۔ اس کے اور کسی ردِ عمل کی خبر نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ سن کر ہنس پڑا اور اس نے صرف اتنا کہا ـــــ ویری پور ٹیسٹ! ساحر کو زندگی کا سب سے بڑا ایک کمپلیکس ہے ـــــ کہ وہ خوبرو نہیں ۔ اسی میں سے اس نے میرے پور ٹیسٹ کی بات کی ۔

اس سے پیشتر بھی ایک بات واقعہ ہوئی تھی ـــــ ایک روز اس نے میری بچی کو گود میں بٹھا کر کہا تھا ـــــ "تم کو ایک کہانی سناؤں!" اور جب میری بچی کہانی سننے کے لیے تیار ہوئی تو وہ سنانے لگا ۔ "ایک تھا لکڑہارا، وہ شب و روز جنگل میں لکڑیاں چیرتا تھا ۔ پھر ایک روز اس نے جنگل میں ایک شہزادی کو دیکھا، بڑی حسین! لکڑہارے کا جی چاہا، وہ شہزادی کو لے کر دوڑ جائے ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر؟" میری بیٹی کہانیوں میں ہوں، کرنے کی عمر کی تھی، اس لیے بڑی توجہ سے کہانی سن رہی تھی ۔ میں صرف ہنس رہی تھی، کہانی میں دخل نہیں دے رہی تھی ۔

وہ کہہ رہا تھا ـــــ "لیکن تھا تو لکڑہارا نا، وہ شہزادی کو صرف دیکھتا رہا دور فاصلہ پر کھڑے ہو کر، اور پھر اداس ہو کر لکڑیاں کاٹنے لگ پڑا ـــــ سچی کہانی ہے نا؟"

"ہاں، میں نے بھی دیکھا تھا!" معلوم نہیں، بچی نے یہ کیوں کہا ۔

ساحر ہنستا ہوا میری طرف دیکھنے لگا ـــــ "دیکھ لو، اس کو بھی معلوم ہے!" اور بچی سے پوچھنے لگا "تم وہاں ہی تھیں نا، جنگل میں؟"

بچی نے ہاں میں سر ہلایا ۔

ساحر نے پھر اس کو گود میں بیٹھی ہوئی سے پوچھا ـــــ "تم نے اس کو، لکڑہارے کو بھی دیکھا تھا نا؟ بھلا کون تھا؟" بچی کو اس لمحے کوئی الہام اترا لگتا تھا ۔ کہنے لگی ـــــ "آپ!" ساحر نے پھر پوچھا ـــــ "اور وہ شہزادی کون تھی؟"

"ماما!" بچّی ہنسنے لگ پڑی۔

ساحر مجھ سے کہنے لگا — "دیکھا، بچّوں کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے!"

پھر برسوں بیت گئے۔ ۱۹۶۰ میں جب میں بمبئی گئی تو ان دنوں راجندر سنگھ بیدی سے ان دوست تھے۔ اکثر ملا کرتے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے پوچھا — "پرکاش پنڈت سے ایک بات سنی تھی کہ نوراج ساحر کا بیٹا ہے......"

اس شام میں نے بیدی صاحب کو اپنے اس عالم دیوانگی کی بات سنائی، کہا — "یہ تخیل کا سچ ہے، حقیقت کا سچ نہیں!"

انہی دنوں میں ایک روز نوراج نے بھی سوال کیا۔ اس کی عمر اب قریب تیرہ سال تھی — "ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتا دو گی؟"

"ہاں!"

"کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں؟"

"نہیں!"

"لیکن اگر ہوں، تو بتا دیجئے! مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں!"

"ہاں، بیٹے! مجھے بھی اچھے لگتے ہیں، لیکن اگر یہ سچ ہوتا، تو میں تم کو ضرور بتا دیتی!"

سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ میرے بچّے کو یقین آ گیا۔

سوچتی ہوں — تخیل کا سچ جھوٹا نہیں تھا، تاہم وہ صرف میرے لیے تھا، صرف میرے لیے، اس قدر کہ وہ سچ ساحر کے لیے بھی نہیں۔

لاہور، جب کبھی ساحر ملنے کے لیے آیا کرتا تھا، تو گویا میری ہی خاموشی میں سے خاموشی کا ٹکڑا، کرسی پر بیٹھتا تھا، اور چلا جاتا تھا۔

وہ چپ چاپ صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ قریب آدھا سگریٹ پی کر راکھدانی میں بجھا دیتا اور پھر نیا سگریٹ سلگا لیتا۔ اور اس کے جانے کے بعد صرف سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے.....

کبھی ایک بار — اس کے ہاتھ کا لمس لینا چاہتی تھی، لیکن میرے سامنے

میرے ہی رواجی بندھنوں کا فاصلہ تھا جو طے نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی تخیل کی کرامات کا سہارا لیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد، میں اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی تھی۔ اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو تنہائی میں بیٹھ کر جلاتی تھی، اور جب ان کو انگلیوں میں پکڑتی تھی، محسوس ہوتا تھا ـــــ جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوؤں....

سگریٹ پینے کی عادت مجھے اس وقت پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ سلگاتے وقت محسوس ہوتا ـــــ وہ پاس ہے۔ ـــــ سگریٹ کے دھوئیں میں سے جیسے وہ جن کی طرح نمودار ہو جاتا تھا....

پھر برسوں بعد، اپنے اس احساس کو میں نے "ایک تھی انیتا" ناول میں قلم بند کیا۔ لیکن ساحر کو شائد ابھی تک سگریٹ کی اس تاریخ کا علم نہیں۔

سوچتی ہوں، ـــــ تخیل کی یہ دنیا صرف اس کی ہوتی ہے جو اس کو تخلیق کرتا ہے اور جہاں اس کو تخلیق کرنے والا خدا بھی اکیلا ہوتا ہے ـــــ

آخر جس مٹی سے یہ جسم بنا ہے، اس مٹی کی قیاسی تاریخ میرے خون کی حرکت میں ہے ـــــ دنیا کی پیدائش کا وقت، جب آگ کا ایک گولہ سا ہزاروں برس پانیوں میں تیرتا رہا، اور پھر اسی آگ میں سے ہر گناہ کو جلا کر راکھ کر کے جو جاندار ظاہر ہوا، وہ اکیلا تھا۔ اس کے اندر نہ تنہائی کا خوف تھا، نہ تنہائی کی مسرت۔ پھر اس نے اپنے ہی بدن کو چیر کر ـــــ نصف حصے کو مرد بنا لیا، نصف کو عورت۔ اور اسی میں سے اس نے کائنات کی تخلیق کی......

کائنات کی تخلیق کا یہ ابتدائی عمل صرف قیاس نہیں، نہ صرف ماضی کی تاریخ یہ ہر زمانے کی تاریخ ہے ـــــ چاہے چھوٹے چھوٹے انسانوں کی چھوٹی تاریخ.....

ـــــ میری بھی.....

ایک ادیب کی ایمان داری

نیپال کے ینواری ادیب، سائی دھوسواں جب دہلی میں اپنی ایمبیسی کے کلچرل سیکریٹری بن کر آئے، چند ہی ملاقاتوں میں محسوس ہوا کہ ان کے اندر کا ادیب ان کے ڈپلومیٹک عہدے سے عظیم ہے۔ ان کے باطن کی یہ کشمکش ان کے لیے سکون بخش نہ تھی ——— یہ، اور اپنی اور کئی ذاتی الجھنیں انہوں نے ایک دوست کی مانند مجھ سے مشترک کیں۔ جب بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے تو مجھے ملنے آ جاتے ورنہ فون تو ضرور کرتے۔ خیر، ایک روز میں نے ان کی قطعاً نجی الجھن کے بارہ میں ایک کہانی لکھی ——— "عدالت!" ——— ان دنوں میں ہندی میں اپنی کہانیوں کی ایک کتاب کمپائل کر رہی تھی، "پنجاب سے باہر کے کردار" ——— اور میں نے اس کتاب کے لیے جو اٹھارہ کہانیاں انتخاب کیں، ان میں سے ایک یہ بھی، عدالت ——— کتاب پریس میں چلی گئی اور میں نے یہ خبر بھی دھوسواں صاحب کو بتائی۔ ہر افسانے کے پیچھے اس کا کردار جس ملک سے علاقہ رکھتا تھا، اس ملک کا نام دیا ہوا تھا۔ اس طرح، عدالت افسانے کے نیچے نیپال کا کردار لکھا ہوا تھا۔ دھوسواں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اس افسانے کے نیچے میں نیپال لفظ کاٹ کر کچھ اور لکھ دوں ورنہ ایک ڈپلومیٹ کی حیثیت میں ان کو مشکل پیش ہو گی۔ میں ان کی پریشانی کسی طور بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس لیے ان کی فرمائش پر نیپال کی بجائے آسام درج کروا دیا۔ کتاب شائع ہو گئی۔ انہوں نے بھی دیکھی، اور مجھے ایک نوٹ لکھ کر دیا کہ میں جب اپنی آٹو بائیوگرافی لکھوں، ان کا یہ نوٹ اس میں ضرور شامل کر لوں۔ وہ نوٹ ہے ——— "یہ کہانی دھوسواں کی ہے، لیکن ثقافتی نمائندہ، ایک محرم، اس قدر کائر اور بزدل ہے کہ اس کہانی کو اجنبی بنانے کے لیے اپنے ملک نیپال کو بھارت کا ایک صوبہ، آسام، بناتے میں اس نے حامی بھر دی!"

۱۶ - ۱۱ - ۱۹۷۳

——— دھوسواں سائی

اس روز دھو سواں میری نگاہوں میں اور بھی بلند ہو گئے ۔ یہ ان کے اندر کے ادیب کی دیانت داری کا تقاضا تھا۔ میں نے احترام کے ساتھ سر جھکا لیا۔

اس کہانی کا ان پر گہرا اثر تھا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو بھی یہ کہانی سنائی اور اپنی دوست لڑکی کو بھی۔ ایک بے چینی کے ساتھ اس کہانی کو بار بار پڑھتے رہے۔ جب تین بار پڑھ چکے تو ان کو ایک بے چین خواب آیا جو انھوں نے تحریر کر کے مجھے دے دیا ——— ان کا خواب تھا ———

”معلوم نہیں، صبح تھی یا شام، آسمان روشنی اور تاریکی کے اشتراک میں پھیلا ہوا تھا۔ میں ایک دریا کی طرف کھنچا چلتا جا رہا تھا۔ اس دریا کو میں روز عبور کر کے گذر جاتا تھا لیکن اس روز اس دریا کے کنارے پر اپنی محبوبہ کو، جو شادی شدہ اور بچوں کی ماں تھی، دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ اس دریا کو پار کرنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔ شائد تحت الشعور میں غرقابی کا خوف جاگزیں ہو گیا تھا۔ میں دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن اس وقت سب طرف ریت ہی ریت دکھائی دینے لگی۔ اس ریتلے میدان میں میں نے دو خیمے نصب ہوئے دیکھے۔ میری آنکھوں کے سامنے خیمے کا اندرونی منظر نمایاں ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر ایک مرد موجود ہے جس کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جس کے جذبات و خیالات ایک آئنے کی مانند میرے اندر ٹرانسمٹ ہو جاتے تھے۔ اس کے روبرو تین طرح کے پوشاکیں پہنے، لیکن ایک ہی چہرے والی تین دوشیزائیں کھڑی تھیں۔ آدمی پریشان سا ہو گیا۔ کیونکہ ان میں سے ایک اس کی محبوبہ تھی۔ یہ کیسا چھلاوہ ہے، وہ اس سوچ میں ڈوب گیا ۔ اس کی حیرت کو دیکھ کر ان دوشیزاؤں میں سے ایک کی آنکھوں میں کپکپی آئی، اور وہ آگے بڑھ کر اس مرد کے بازوؤں میں آ گئی لیکن اس وقت دوسرے خیمے میں سے ایک مرد غصّے میں بولتا وہاں آیا اور اس لڑکی کو جھڑکنے لگا ——— تم اس زنداں میں کیوں پڑتی ہو، یہ تو شادی شدہ ہے، یہ تو ایک بھونرا ہے . . . . لڑکی نے جھٹ سے جواب دیا ——— میں یہ سب جانتی ہوں، پھر بھی اس کو اپنا رہی ہوں . . . . اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دوسرے خیمے سے وارد ہونے والے آدمی کا سر دھڑ سے غائب ہو گیا ہے۔ پہلے آدمی نے اس لڑکی کو جوش کے ساتھ اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا ——— اور اس وقت دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ میں، جو بغیر سر کے ہوں، اور وہ آدمی جس کا سر نہیں، وہ آدمی جو پوری طرح وہاں تھا، مجھ میں

سماتے جا رہے ہیں ۔ دفعتہً آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ امر نا پریتم کا کہانیوں کا مجموعہ "شہر کی موت" میرے پاس کھلا ہوا رکھا ہے جس کی ایک کہانی ، عدالت میں تیسری بار پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔

۱۸ - ۱۱ - ۱۹۷۳

دھوسواں سائٹی

یوں تو اپنی ہر کہانی کے کردار کے ساتھ میری اپنائیت ہے ، کہانی لکھتے ہوئے میں اس کا درد اپنے دل پر جھیلتی ہوں ، اس کی تقدیر کچھ دیر کے لیے میری تقدیر بن جاتی ہے ، اور اس طرح یہ اپنائیت دوام کا حصہ بن جاتی ہے ۔ لیکن دھوسواں ایسے کردار میرے اندر صرف پیار اور ہمدردی ہی نہیں ، اپنے لیے عزت و احترام بھی جگا لیتے ہیں ۔

سیاہ کالی گھٹا

اچانک ـــــ ایک دن ایک نظم لکھی گئی تھی ـــــ
آج شیلف پر جتنی کتابیں تھیں
اور جتنی اخباریں
وہ ایک دوسری کے ورق پھاڑ کر ، جلدیں ادھیڑ کر
کچھ اس طرح لڑیں
کہ میرے خیالوں کے شیشے کرکرا ٹوٹتے رہے .....
ملکوں کے نقشے ، اور ساری حدیں سرحدیں
ایک دوسرے کو بانہوں اور لاتوں سے گھسیٹ کر گراتے رہے .....
اور دنیا کے جتنے بھی ازم تھے ، اعتقاد تھے
وہ سب کے سب ایک دوسرے کے گلے گھونٹتے رہے .....
گھمسان کی لڑائی ـــــ بے انتہا خون بہا
ـــــ لیکن کتنا حیرت ناک واقعہ
کہ کچھ کتابیں ، اخبار ، ازم اور نقشے ایسے تھے ـــــ
جن کے جسموں سے ـــــ
سرخ لہو کے بجائے ایک کالا زہر بہتا رہا . . .

محسوس ہوا ــــ اداسی، بوند بوند اکٹھی ہوتی رہی تھی، اور اس دن سیاہ، کالی گھٹا کی مانند میرے سر پر چھا گئی تھی، یہ اپنے زمانے کی پست سطح کی اخبار نویسی اور معاصروں کے شوشوں سے لے کر ــــ دور دور تک مذہب، سماج اور سیاسیات کی ان حرکتوں تک پھیلی ہوئی تھی جن کی رگوں میں سرخ خون کے بجائے کالا زہر حرکت میں ہوتا ہے . . . .

یہ اندھیرا شاید اسی لیے تھا کہ یہ کاغذ اور یہ حرف، میں نے دنیا میں سب سے اونچی ادب و احترام کی جگہ پر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ محسوس ہوا ــــ ۷۵۱ میں جب چین کے لوگوں نے سمرقند پر حملہ کیا، حملے میں شکست کھائی، اور ان کے جو لوگ عربوں کے جنگی قیدی بنے، ان میں سے جن کو کاغذ بنانے کا ہنر آتا تھا، عربوں نے ان سے وہ ہنر سیکھ کر پہلی بار کاغذ بنایا ــــ تب اس پہلے کاغذ پر، جس ہاتھ نے پہلی نظم تحریر کی تھی، اس ہاتھ کی لرزش آج بھی میرے ہاتھ میں ہے . . . .

او خدایا . . . .

میری دوست

جب "رسیدی ٹکٹ" شائع ہوئی، اندرا میری واحد دوست ہے، جس کو میں نے وہ کتاب بھیجی، اور اس کے صفحہ اول پر لکھا ــ "میری دوست! تجھے تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ لیکن دیکھ! آج سارے عالم کو اپنے زخم دکھا دیے" اس ایک سطر میں سب کچھ کا علم ہونے کا ایک لمبا عرصہ ہے، ستئیس برس کا ــ

یہ واحد دوست ہے جو اب جنوری ۱۹۷۷ میں کینیڈا سے آئی، تو آتے ہی بولی ــ "ری، میں تمہیں بیچ کے کھا آئی ہوں . . . ." جس کا مطلب صرف اسی قدر تھا کہ اس نے لندن سے گلاسگو فون کر کے کچھ دن جس کے گھر میں رہنے کا بندوبست کیا، میرا نام لے کر کیا، میرا حوالہ دے کر کہ میں اس کی دوست ہوں۔ جب امروز کا نام وہ صرف اندرجیت جانتی تھی، ایک بار عرصہ بعد ملی، اسی طرح گلے سے لگ کر، تب تخلیے میں لے جا کر مجھ سے پوچھنے لگی ــ "ری، ایک بات بتا، اب تو نے اندرجیت کو بھی چھوڑ دیا؟" مجھے اس کے سوال کی سمجھ نہ آئی تو کہنے لگی "لوگوں سے سن کے آئی ہوں کہ اب تو کسی مسلمان، امروز کے پاس رہتی ہے!" یہ امروز ہی اندرجیت ہے! میں نے بتایا۔

لیکن روح کی عمیق ترین گہرائیوں تک جان لیا کہ یہ امروز اگر وہ اندر جبیت نہ بھی ہوتا، کوئی دوسرا ہوتا، تو بھی میری یہ دوست اونار، یہی دوست اوتار ہی رہتی . . . .

سینتیس سال لمبی ایک تسلی ہے، جس کا نام اوتار ہے۔ یہی دوست ہے جو آج بھی میرے مونہہ سے ساحر کی بیماری کا حال سن کر بمبئی گئی تو اس ہسپتال تک بھی پہنچ گئی، جہاں ساحر تھا۔ جا کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اس کی پیشانی چومی اور رو کر اس کا حال دریافت کرتی رہی۔ میرے پاس آئی تو کہنے لگی — "گئی تھی، اس کے سینے پر سر رکھا تو محسوس ہوا یہ میں نہیں، تو ہے۔ تیری جگہ گئی تھی، تو بن کر . . . ." یہ دوستی کی کیسی بلندیاں ہیں، کبھی کبھی میری اپنی آنکھیں بھی بند ہو جاتی ہیں . . . .

یہی دوست ہے جس کے بارہ میں "قرمزی لکیریں" میں، میں نے "ایک پل کا قرض" لکھتے ہوئے لکھا تھا — "جن دنوں نظم لکھی "دکھاں دا ساہ جلا اسیندا اہیہ سنجوگ ہی، میں تاں جنم جلی" دنیا کے سارے چہرے میرے لیے اجنبی بن گئے تھے اوتار کا ٹیلی فون آیا — "تمہیں ملنے کے لیے آ سکتی ہوں؟" جواب دیا۔ "نہیں!" اس نے پھر کہا — "کچھ ایک ثانیوں کے لیے؟" پھر جواب دیا "نہیں"! — ایک خاموشی چھا گئی۔ یہی خاموشی چاہتی تھی، جس میں کوئی شناسا آواز سنائی نہ دے۔ آدھ گھنٹہ بیت گیا۔ ملاقاتی لوگ گھر کے اگلے دروازے کی راہ سے آتے ہیں۔ عقبی دروازے سے کوئی صفائی کرنے والا آتا ہے یا سبزی بیچنے والا۔ اور جب عقبی دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے کھولا، تو اوتار جلدی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ معذرت کرتے ہوئے کہنے لگی "— میں نے تمہارا کہا نہیں موڑا — تم نے سامنے کا دروازہ میرے لیے بند کیا تھا، میں نے اس دروازے کو نہیں کھٹکھٹایا . . . ." یہ اوتار ہے، جو دل کے اندر کسی بھی دروازے سے داخل ہو سکتی ہے . . . .

وہ زمین و آسمان کو بانہوں میں لیتی شخصیت میرے الفاظ میں نہیں سماتی۔ شائد اس کے اپنے لفظوں میں وہ کچھ سمجھی اگرفت میں لی جا سکے، اس لیے اس کے دو خط، اپنی زندگی کی امارت کے حساب میں، یہاں شامل کر رہی ہوں —

۶ جون، ۱۹۷۵ء

پیاری افزا!

معلوم نہیں، کیوں، لگتا ہے کہ بغیر کچھ کہے کہے ہی تو جان نے گہ جان لیا ہے صادقی کی ساری تو نے

مجھ کو ابھی بھی کچھ بچ گیا ہے، نہ جانا ہوا۔ جو کچھ اپنی ہستی کا بے حد اسینشل لگتا ہے، وہ پھسل پھسل جاتا ہے، فراست میں سے، لفظوں کی گرفت میں سے آرٹی کولیٹ ہی نہیں ہوتا، الفاظ کے حصار میں نہیں سمٹتا۔ الفاظ اس کی وزنی 'جان' اور 'حدت' کو اٹھانے سے معذور ہیں۔ جب بھی کچھ کہنے لگو —— لگتا ہے، یہ تو اپنے ایک ایٹم کی، ایک سیل کی، ایک پور کی، ایک ترد کی کہانی ہے، باقی کروڑوں کی ان کہی چلی جائے گی۔

ٹوٹیلٹی کے قیاس کا احساس کبھی کبھار صرف خاموشی میں آنکھیں بند کر کے، چھاتی پر ہاتھ رکھ کر، پیشانی کی لرزش میں محسوس ہوتا ہے۔

میں کوئی استثنیٰ نہیں۔ ہر انسان اپنے آپ میں ایک عجیب حیرت خیز دنیا ہے، حالات کی —— کنڈیشننگ کی بھٹی میں پگھلا اور ڈھلا، حادثات کا پچھاڑا، جھنجھوڑا، چھانٹا، کہیں سے کٹا پھٹا، کہیں سے دست بریدہ، کہیں سے لنجا، تاہم بڑا ہی پیارا ہیومن، گرتا، ہمت سے اٹھتا، شکست تسلیم نہ کرتا، سعی و جہد کے تفاخر کی دمک پیشانی پر لیے، آگے ہی آگے چلتا چلا جاتا ہے۔

تمہارا خط آیا۔ یوں لگا تم نے بانہوں کے حصار میں لے لیا ہے۔ نگوڑی! کیا جانتی ہو، تم سے ایک محبوب ایسا پیار آتا ہے۔ تصور میں —— تمہاری خوشبو اسگریٹ کی خوشبو کے ساتھ ملی جلی تمہارے جسم کی خوشبو —— میں نے لمبا سانس لے کر پی ہے۔ نگوڑی سگریٹ میرا دامن نہیں چھوڑتی۔ دنیا نے تمہاری یہ حسرت دل بھر کے پوری کر دی ہے۔ وہ قریب ہوتی ہے تو مجھے پیار کرنے والوں کی پہچان بھی اب اس مہک سے ہونے لگ گئی ہے .... ہے یا نہیں آنرلی؟

ہاں، وہ دنیا کا ذکر تھا —— بالکل نیلگوں کرہ ہے، سیاہ، موٹی نسوں اور نسوں کی غار میں رچی ہوئی بھی، انتہا کی حدت دیے جاتی ہے۔ اس کا وجود کسی شے کے کانسنٹریٹڈ شکل میں کیپسول میں بند ایسا، یا باریک نلکی میں سے خارج ہوئی کسی تیز بو والا ہے۔ جہاں بھی اس کی پھونک پڑتی ہے، وہاں دل و دماغ کا گوشت یا تو جھلس جاتا ہے یا ہمیشہ کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ سمٹا ہوا ایک نقطہ بن کے، ایک زاویے پر ٹکی ہوئی، وہ میرے عین برعکس ہے۔ میں تو جگہ جگہ، دانہ دانہ بکھری ٹی مٹھی میں سے کچھ ادھر ادھر چھٹکے ہوئے ایسی ہوں،

تبھی تو وہ جلدی ہی مجھ سے اکتا جاتی ہے ۔ کبھی کبھی لڑھک پڑتی ہوں ۔ وہ جسے بھی محبت کرے گی، وہ ایک طرف ہی لڑھکا جائے گا ۔ اتنی بہیم اور ایک سی طاقت ور اس کی کشش ہے ۔

بیراگ، اینگوئش بریکنگ پوائنٹ، دل بھر کر اور ٹوٹ بیٹھنے کا، قدرتی و فطری طور سے اسے سمیٹ لینے کا اس کو ڈھنگ ہے، شوق ہے، تمنا ہے ۔ یہ کچھ اس کی ساخت میں ہے ۔ اسے وہی لمحات دھڑکتے محسوس ہوتے ہیں، زندگی کی رو سے، جن لمحے وہ درد سے کراہ رہی ہو، سانس تکلیف سے آ رہا ہو، پیشانی اور ہونٹوں پر ضبط کا تشنج ہو، اور جسم کی نس نس میں ٹوٹ رہا ہو، کرب کی لکیریں برقی رو کی مانند آر پار گذر رہی ہوں، اس گھڑی اس کو لگتا ہے، وہ جی رہی ہے ۔ یہ تو ہلکا سا اس کے ظاہری وجود کا عکس ہے، معلوم نہیں، اس کا دل اور روح کس کس کرب، تڑپ اور تشنج میں سے گذرتے ہوں گے جیسے بھیانک زلزلے زمین کے نیچے دبے، جب پہلو بدلتے ہیں، تو سطح پر معمولی سی ہلچل اور شائیں شائیں ہی سنائی دیتی ہے ۔

اپنی چھاتی کا درد برداشت ہو جاتا ہے، کچھ لطیف سا لگتا ہے، دوسرے کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ـــــ کرب کی سسک لیکن طاقتور آنکھوں کا احساس ہوتا ہے، دوسروں کے درد کو برقی لمس کے ساتھ اندر داخل کرنے پر ـــــ بھلا کیوں کوئی اندر آ سماتا ہے، اپنا گھر سمجھ کر ڈٹ جاتا ہے ۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی باہر نہیں جاتا، اور کسی کو اندر آنے نہیں دیتا، خدایا! کب تک کوئی دربان بن کے دروازے پر بیٹھا رہے گا!

انسان اپنے خون سے زیادہ قیمتی کوئی آبِ حیات پلاتا ہے، اپنے آپ کو، اس کشش کا زہریلا اور کسیلا، لیکن طاقت ور، ذائقہ چکھنے کے قابل بنانے کے لیے ۔

نیک ساعت ہوتی ہے ملن کی، جب دو دل کہیں ایک ڈائمنشن میں، ایک فلو میں بہتے ہیں ۔ باقی بے نتل ڈائی مینشنز کا راگ مدھم پڑ جاتا ہے تو ہی ایک ڈائمینشن کا وجود، دونو فریقین کے لیے بڑا ہی خوبصورت لمحہ، دوام اور خود کے غائب ہونے کا احساس دیتا ہے . . . . .

بڑا کچھ جل جل کر بھی کچھ جلنے سے بچا رہا، جس نے اب ارغوانی لو چھوڑی ہو گی ۔ اپنی غیر طمانیت کی ذمہ داری کسی پر تھوپنے کو جی نہیں چاہتا اب، اپنے اوپر لینے کو چاہتا ہے ۔

سب کچھ اپنے جسم سے اسے ٹھے دھوئیں کا بال بنی ہیں، لیکن اور سینوں کو بھی ٹھوک بجا کر، کھرچ کر دیکھا ہے، بڑا کچھ وہی ہے۔ اسے بھوک اس خود کو کھرچنے، تڑلانے، دلارنے کی —— کبھی بھی کچھ تسلی دیتا محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ مانند پڑے گی، لیکن کرنے کے بعد مغالطے کا احساس مضبوط ہوتا ہے۔

جہاں بے اطمینانی ہے، وہاں تسلی بھی ہے کہ گھبرا کر سب کچھ ہاتھ سے پرے نہیں کر دیا۔ اس کو پورا روبرو رکھ کر دیکھنے کی جرأت کی ہے۔ اس کو اوپر اچھال کر، پھر گرنے پر، اس کے گرتے سنبھلتے وجود کو دیکھنے کی ہمت کی ہے۔ اب دکھاوے کے طور پر اچھا اچھا کہنے سے کام نہیں چلتا۔

کہیں کوئی سخت ہی ادھورا پن، محرومی اور خلا رہ گیا ہے۔ شاید یہ ہر انسان کی تقدیر ہے۔ بالکل تنہا، اداس، ایک پاؤں کہیں، دوسرا کہیں۔ لیکن کہیں پر کوئی دوستی کا احساس دیتا ہے، پروانہ ہونے کا۔

کیوں ایک نقطے کو کھینچ تان کر کائنات جتنا بڑا کر کے اوڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو ظاہر حقیقت ہے، اصلیت ہے، سچ مچ ویسی کی ویسی دکھائی نہیں دیتی۔ رات کی خنک خاموشی، چاند کا اکیلے آسمان پر ہونا، مدھم چاندنی کا پھیلاؤ، ایک امر بیل کی طرح خاموش، یہ سارا کچھ صرف رات، ہی کیوں نہیں لگتی؟ کیوں لگتا ہے، یہ تو میں ہوں ہر کسی حالت میں کہیں لگتی ہوں ... ——

کتنا ڈال کر بھی کتنا خالی —— یہ احساس گہرا دھنستا، فہم کو صاف صاف دکھائی دیتا، دل میں بیراگ پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

ایک جز و یہ میرے وجود کا، دوسرا جو سدا سینس کے بیول پر جڑا رہتا ہے۔ خوشبوئیں، آوازیں، ہوائیں، بے پناہ کشش ڈال رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے، اسی لمحے میں سمٹ کر جیوڑوں، ایک تیتری کی مانند یکسو ہو کر ایک نقطہ پر، ایک طبعی پرواز میں لامحدود آسمان پر میرے پر ٹکے ہوں، میرے بے حرکت کھڑے پروں کے نیچے لامحدود کی پرواز سانس لے رہی ہو۔

نئے پتے روئیں دار نکل رہے ہیں، جینے کے لیے، اگلے روز تک مرجھا کر مر جانے کے لیے، دن رات کی ہستی کو مٹاتا، رات کی گود میں پھر سونے کے لیے۔

مسرت کا موہوم سا احساس ملتا ہے، جسموں کی ایسی رگڑ میں سے، روح اور دل سے نکلتی بے جسم، بے وزن کشش خون میں حدت پیدا کرتی ہے۔ یہ حدت ___ روانی، رفتار، صورت اختیار کرتی، اس لمحے کی انتہاء مسرت، تڑپ کر کچھ ٹھوس شکل میں سامنے پیش ہو جائے ___ اور ساتھ ہی اس کے الٹ، اس سینسز اور تھاٹس کی رینج سے دور کی طبعیات کا کوئی سر چھو جائے۔

مست ہوا، شبنم سے بھیگی مٹی کی مہک سے بوجھل، نئی صبح کی امنگ سے بھری تیزی سے بہہ رہی ہے۔ پیڑ خاموش کھڑے ___ ایک ایک ثانیہ کی تبدیلی اعضاء میں چھپائے، کسی انتظار میں تڑپتے بیدار کھڑے ہیں۔ انسانیت کا سر آدمی، اپنے لیے ساری کائنات کا محور، اپنے اپنے سینے میں نئی دردوں اور مغالطوں کی گٹھڑی اٹھائے، مرئی اور غیر مرئی کو آنکھوں میں بھینچے، آج کے نئے دن، پھر ایک اور دن کے پیسے گردش میں گھومے گا۔ پرندوں کی پیہم چہچہاہٹ لگاتار کہہ رہی ہے۔ صرف مجھے سنو، کچھ نہ دیکھو، سونگھو، احساس کے باقی دروازوں کو بند کر دو کیونکہ ہماری آواز میں سنفنی کا نغمہ ہے۔ سامنے خلاء میں میرا وجود ایک نقطہ بن کر، اوپر والے سمندر میں بڑے چھوٹے بلبلوں کی صورت اختیار کرتا اور ہر اوہر پل بکھر رہا ہے۔

تم نے دنیا کو لکھا کہ افتاد میری مصائب کی سہیلی ہے، بڑا رشک آیا اس کو ان مصائب پر.... کئی بار آنکھوں میں، خون کھینچ کر اس نے سرکے کی طرح یہ جملہ میری آنکھوں میں ڈالا ہے......

تیری افتاد

۱۱۔ اگست، ۷۶

پیاری امرتا!

تمہارا خیال آنے پر، خط لکھتے وقت، تمہارے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، دروازے میں داخل ہوتے ہی تمہاری نگاہیں، تبسم، بانہوں کے پھیلاؤ، جو تم مجھے دیا کرتی ہو، ان کے ساتھ سیانی سیٹیوں میں شرابور ہو رہی ہوں.... معلوم نہیں، روز روز تم کو کیوں لکھنے لگ گئی ہوں....

تمہارا ایک مضمون "ذکر دے، نہ دنیا میں بابلا!" پڑھ کر سر میں پڑا سب کچھ ایک بار جھٹ جاتا ہے۔ عورت کا اندر تو انتہائی متاثر ہوتا ہے، مرد معلوم نہیں، اپنی کنڈیشننگ کی

وجہ سے کتنا رِی سیپیٹو ہے ؛ میری بھی تو کنڈیشننگ ہوئی ہے نا، مرد۔ عورت دکھائی دیتے ہیں، انسان نہیں دکھائی دیتے ۔

تمہاری نظم "سیاہی چوس"؟ . . . کوئی کبھی کبھی کمال کرتا ہے، تم روز روز کرتی ہو، میرے خدا کی طرح آفتاب طلوع کر کے، رات لا کر، رنگارنگ موسم اور نباتات کے روپ بدل کر ۔ ـــــ تم، بی بی! پیغمبر بن گئی ہو . . . .

لیکن سوائے گہری یاس ـــــ کہ کیا کا کیا بن گیا ہے، کیوں بن گیا ہے؟ دل و دماغ میں کچھ خلیج ایسا بنتا ہے، چیرتا ہے، سب کچھ غلط ہو جانے کا درد، سب سے زیادہ، اس کا احساس! لیکن ایک چیز، یہ جو ساری سوجھ ورشتے میں دے جاتی ہے، وہ ہے ـــــ انہا کا کمپیشن!

تمہاری سطریں، ـــــ یہ حرف، جو چھاتی کا اندھیرا ہے ـــــ اس سے آگے یوں لگتا ہے، میں جیسے نہر کے باندھ کی اتھل پتھل میں غرق ہو رہی ہوؤں جہاں سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں ۔ یاس کی آخری حد! اور ـــــ "وہ اصلی عبارت کب کی کھو چکی ہے ـــــ" یہ سسکی کے آخری سانس کو سعیِ بسیار سے کھینچ کر اندر سے لانے، لعاب کے ساتھ بمشکل حلق کے نیچے اتارا ہے ۔ بہن میری! یہ انسان ہونے کی لعنت کہ یہ سچائی جانتا ہے، جان کر بھی اس کے الٹ جھوٹ میں روز رہتا ہے۔ پل پل پردے اترتے ہیں، پھٹتے ہیں . . . . پل پل جانتے بوجھتے غلاف اوڑھتے جاتا ہے۔ لیکن چھاتی میں کچھ پھٹتا ہے، سچ باہر آنے کے لیے تڑپتا ہے ۔ میں دعویٰ نہیں کرتی کہ میرا اس وقت، کا سچ سدا کے لیے ہے لیکن اس لمحے ضرور وہ میرے لیے اہم ہے ۔

چل، چنڈال کہیں کی! میرا اتنا وقت لے گئی ہو . . . . . ایک طرف ہٹ جا اب!

ـــــ تیری، ادتار

ایک مشکل تجربہ

دوستوں یا شناساؤں کو آہستہ آہستہ اپنے سے دور ہٹتے دیکھنا، یا اداس ہوتے

دیکھنا، ایک بڑا تکلیف دہ تجربہ ہے۔ لیکن زندگی کے اس راستے پر بھی چلنا ہوتا ہے..! چلی ہوں.... جن معاصروں کے ساتھ —— ایک ہی شکل و صورت کا تجربہ بار بار دیکھا— الفاظ کے پیڑوں سے ہوتے ہوئے معانی کے پتوں کے جھڑنے ایسا، دلیپ تو انہ ان ہم عصروں میں سے نہیں۔

جانتی تھی — وہ جب کمسن تھی، خواب بنتی کے ہاتھوں سے زندگی نے سلائیاں چھین لی تھیں اور اس کے خواب ادھڑ گئے تھے.... لیکن جب ۲، ۹ کا سال چڑھا، محسوس ہوا، زندگی اپنے کنجوس برسوں کی کمی پوری کرنے کے لیے بڑی سخی بن گئی ہے—— اکٹھے تین ہاتھ اس کی طرف بڑھے، اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ایک ہاتھ شہرت کا تھا جس نے اس کی قلم کو اکادمی کا ایوارڈ دیا اور مسکرا پڑا۔ اور دوسرے، دو مردوں کے ہاتھ تھے جو اس کا ساتھ مانگ رہے تھے۔ دلیپ نے مجھے پٹیالہ سے آواز دی۔ میں گئی، اور دیکھا —— زندگی کے اس فعل کو ہاتھ سے چھونے کے لیے اس کے کانپتے کانپتے ہاتھ آگے بھی بڑھ رہے تھے، — اور آگے بڑھنے سے گھبرا بھی رہے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک کو، دلیپ برسوں سے جانتی تھی، اور ایک کو صرف کچھ مہینوں سے۔ عجیب سبب تھا کہ جس کو وہ زیادہ جانتی تھی، اس کو میں بھی کچھ جانتی تھی۔ اور جس کو وہ تھوڑا سا جانتی تھی، اس کو میں بالکل ہی نہیں تھی جانتی۔ لیکن اس کے ہاتھ اس طرف کو بڑھ رہے تھے —— جدھر اس کا کچھ بھی جانا پہچانا نہیں تھا۔

میں نے ایک دو بار دل کی تسلی کے لیے دلیل کا سہارا لیا۔ لیکن دیکھا —— دلیل سے آگے کہیں کچھ تھا جو سوتی جاگتی دلیپ کو بلا رہا تھا۔ یہ بلاوا، معلوم نہیں، اس نے کس طرح سنا تھا کہ اس کے کان اس نے موم جیسے لگتے تھے، اتنے کہ دلیل سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کے ساتھ۔ یہ وقت شاید کچھ کہنے کا نہیں تھا، یہ صرف اس کے پہلو میں کھڑا ہونے کا وقت تھا....

اس نے کہا —— "ایک مختصر سی رسم کرنا ہے..... لیکن پٹیالہ میں نہیں!" جواب دیا —— "تمہارا گھر صرف پٹیالہ میں نہیں، دلی میں بھی ہے!"

۳۰ مارچ کے روز دلیپ کو ایوارڈ ملنا تھا۔ وہی ایوارڈ اس کی شادی کا تحفہ بن گیا۔ شام کا ماحول پوجا اور ہون کی سمگری سے مہکا ہوا تھا۔ کنیادان کے لیے امروز

نے ہاتھ آگے کیا اور بھائی کی جگہ میرے لڑکے نے تنے کھڑے ہو کر دلیپ کا پلو پکڑا یا۔ . . .
دلیپ کو وہ واقعہ یاد تھا ——— میرے لڑکے کی شادی کا، جب اس کی گجراتی دلہن کے کنیا دان کے موقعہ پر ——— اس خالی جگہ کو بھی امروز نے پُر کیا تھا - آج جب دلیپ کی زندگی کی خالی جگہ پر بھی امروز کھڑا ہو گیا تو دلیپ نے اس کو "غیر مولود بیٹیوں کا بابل" کہہ کر میرے رشتے کے ذریعے نہیں براہ راست اپنے رشتہ کے ذریعے، اس کے ساتھ تعلق جوڑ لیا . . . .

تین دن بعد، دلیپ کو اس کے شوہر کے ساتھ وداع کرتے وقت یوں دل بھر آیا، جیسے سگی ماں یا سگی بہن کا دل ڈوبتا ہے - اور اس لمحے میں نے پہلی بار اس کے مرد کو ایک تگڑے مرد کے روپ میں دیکھا، جب اس نے کہا۔ "اب آپ فکر نہ کریں ———" سچ مچ اس لمحے وہ دلیپ سے بھی بڑی عمر کا ہو گیا معلوم ہوتا تھا۔

یہ دلوں کی عمر کس حساب سے بڑھتی گھٹتی ہے، کسی کو بتلا سکنے کی گرفت میں نہیں آتا۔ امروز بھی کئی بار میرے ۵۲ برس کا ۲، ۵ سے ادھر کر کے اس کو ۲۵ بنا لیا کرتا تھا، اور اپنے ۴۶ برس کے ہندسوں کو الٹ کر ۶۴ برس کا بن جایا کرتا تھا . . . . دلیپ کا روپ بھی اس روز اسی طرح کا تھا ——— گویا وہ اپنی عمر کے ستائیس ۲۷ اٹھائیس ۲۸ سال مائینس "بیٹھی رہی ہو، اور اب سرخ و سبز، لباسِ عروسی پہن کر اس پر لوک گیتوں کی گوری کا ایسا جوبن آیا ہو . . . .

پھر عجیب دن آئے۔ میرے لیے ایک ہی دریا میں، جیسے کنارے پر ٹھنڈا یخ پانی بہتا ہو اور دوسرے کنارے پر گرم، البتہ وہ جس کو دلیپ نے اپنے ساتھ کے بے پانی بہتا ہوا اور دوسرے۔ کنارے پر گرم، البتہ وہ جس کو دلیپ نے اپنے ساتھ کے بے نہیں جیا تھا، میں نے اس کی دیوانگی کا عالم دیکھا . . . . اس کی وہ نظمیں سنیں جن کو صرف دل میں جلتی آتشِ سوزاں لکھوا سکتی ہے . . . . اس نے اپنی یک طرفہ محبت کی تقدیر کو قبول کر لیا تھا، لیکن اس کے دل میں گہرا بیراگ آ گیا تھا۔ کبھی کسی دن مجھے اس کا خط آتا، جس میں مرنے کی خواہش سے بھری ہوئی ایک آدھ سطر ہوتی، اور کچھ نہیں۔ میں اس کی اداسی سے اداس تھی، لیکن دلیپ کو خوش دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے کبھی اس کی بات دلیپ کو نہ سنائی۔ دلیپ کو خوش دیکھنا اس کی بھی لگن تھی۔ اور اس نے دلیپ کے راستے سے گذرنا بھی چھوڑ دیا ——— گو اپنی زندگی کے تمام راستوں پر اس کو صرف دلیپ دکھائی دیتی تھی . . . . جانتی ہوں ——— دلیپ کے دل میں اس کا خیال نہیں تھا۔ اس کا جو کچھ بھی تھا، اپنے ہی خیالوں کا جادو تھا۔ تاہم جادو، جادو ہی ہوتا ہے۔ جب اس کی نظم

میں اترتا، نظم بن جاتا....

میرے پاس اس کا ایک خط ابھی تک سنبھال کے رکھا ہے "۔۔۔ جب سے دہلی آیا ہوں، آپ کو کچھ نہیں لکھا۔ جب بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے، مجھے رونا آجاتا ہے۔ پتہ نہیں، کیوں،.... ہر وقت شراب پینے کو جی چاہتا رہتا ہے..... آپ کا ناول ــــ "دلی کی گلیاں" ــــ کیا وہاں ختم نہیں ہو سکتا تھا، جہاں کئی برس بعد، جب سُنیل کامنی کو اس کے دفتر میں ملنے کے لیے آتا ہے، چار بجے، اور دفتر کے بند ہونے کا وقت پوچھ کر لوٹ جاتا ہے، اور پانچ سال بعد پھر آنے کے لیے کہہ جاتا ہے، اور اس دوران میں کامنی، ناصر کو فون کر کے یہ سب کچھ بتا دیتی ہے، اور ناصر کہتا ہے کہ تمہیں ضرور اس کے ساتھ جانا چاہیئے..... جو بھی ناصر ہے، وہ یہی کہتا ہے.... ناصر نے ہمیشہ یہی کہا ہے، یہی کہے گا.... اور ناصر کبھی کامنی نہیں ہو سکے گا..... لیکن آپ نے کہانی میں ناصر سے کیوں کامنی کے دروازے پر دستک دلا دی؟ کیوں؟ ناصر کو کبھی یہ نصیب نہیں ہوا۔ اس کی تقدیر ہے کہ اس نے ہر راستے پر چلنا ہے، ہر رنگ میں جینا ہے... میں آج کل نہ پٹیالہ میں ہوں، نہ چنڈی گڑھ، نہ لدھیانے، نہ گاؤں میں.... ہاں ان شہروں کو ملاتی سڑکوں پر سفر کر رہا ہوں، بھٹک رہا ہوں..... لیکن یہ کہنا شاید اس طرح معلوم ہوگا جیسے میں رحم کا طلب گار بن رہا ہوں.... آپ کا اپنا ــــ جس کا آج کوئی ایڈریس نہیں........

میں نے یہ خط کبھی دلیپ کو نہیں سنایا تھا۔ لیکن سنا ہے ــــ اس کے گھر کا پتہ بھی اس سے گم ہو جا رہا ہے، دلیپ کے نہیں، اس کی بیبے جی کے بول کانوں میں پڑے ــــ "سب پچھلے جنموں کے حساب کتاب ہوتے ہیں، بیٹی!"

دلیپ سے جب بھی خط لکھ کر دریافت کیا، تو وہ ہر بار جواب کو ٹال گئی۔ اور ہر بار کچھ اس طرح لکھ دیتی "آپ میری فکر نہ کیا کریں..... طاقت جواب دیتی محسوس ہوتی ہے، بخار آتا رہا تھا، لیکن فکر نہ کیجیئے گا..... موت کے نزدیک سرکنے کا احساس بھی عجیب ہوتا ہے..... پھر بخار آنے لگا ہے..... میرا فکر نہ کیجیئے گا......"

"یہ فکر نہ کیجئے گا" جیسے اس کا تکیہ کلام بن گیا لگتا تھا۔ ہر خط میں یہی فقرہ۔ ناداں

نے آنا نہ سوچا کہ وہ جب بار بار کہے گی "فکر نہ کرنے گا" تو اس میں سے کتنا فکر پھینکے گا؟

صرف ایک خط میں اس نے لکھا "۔۔۔ آپ نے کبھی نظم لکھی تھی ۔۔۔۔ "پھولوں کا تھا اک قافلہ اگرم ریگ زاروں سے گذرا ۔ ۔ ۔ ۔" آج میرا جی چاہتا ہے، ایک ناول لکھوں جس کا آغاز بھی یہ ہو، اور انجام بھی!"

یہ خط بہت کچھ کہہ گیا، بندلبوں سے بھی۔ اور آئندہ اس کے خط کی سطریں اور کم ہوتی گئیں، اور پھر ایک سے دوسرے خط کا درمیانی وقفہ طویل ہوتا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار پھر اس کا گونگا سا خط آیا ۔۔۔۔۔ "آج "غیر مولود بیٹیوں" کا بابل یاد آگیا تو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ آپ نے کہا تھا نا، کہ دوستوں پر یقین نہ چھوڑنا ۔ ۔ ۔ ۔"

اور طویل عرصہ کے بعد جب ایک بار دلیپ ملی تو پوچھا ۔۔۔۔ "دلیپ! تمہاری چھپ رہی کتاب کا انتساب ہے ۔۔ تاریخ صرف تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہوتی۔ کتابوں میں لکھے جانے سے بہت عرصہ پہلے تاریخ لوگوں کے بدنوں پر لکھی جاتی ہے۔ اور اس کتاب کا انتساب ان لوگوں کے نام ہے جو تاریخ کا اپنے بدنوں پر لکھا جانا برداشت کرتے ہیں۔ سو ایک طرح سے تم نے یہ کتاب اپنے آپ کو پیش کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ کہنے لگی ۔۔۔۔ "آپ کہتے ہیں، تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔"

کہا ۔۔۔۔ "پھر اس تاریخ کی بات کر، جسے بدن پر لکھا جانا تم نے سہہ لیا!"

اس نے آواز بند کرلی۔ کہنے لگی ۔۔۔ "ساری ہی باتیں لفظوں میں ہی نہیں کہے جاتے ۔ ۔ ۔ ۔"

پوچھا ۔۔۔ "کبھی میں نے لکھ کر تمہاری باتیں کی تھیں، اور ان باتوں کا نام رکھا تھا ۔۔ "فری زون میں ایک رات ۔ ۔ ۔"۔ لیکن آج کی باتیں، اگر لکھوں، تو اس کا کیا نام رکھوں؟"

کہنے لگی ۔۔۔ "فری زون کے الٹ کیا لفظ ہوتا ہے؟ جو ہوتا ہے، وہی رکھ دیجئے!"

آنکھوں میں پانی سا بھر آیا، کہا "نہیں، فری زون نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

سوچتی ہوں ۔۔۔ یہ بھی شائد زندگی کا ایک موڑ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوسکتا ہے، موڑ گھوم کر زندگی اس کو پھر اس خندہ راستے پر ڈال دے جو اس نے ۱۹۷۲ کے آغاز

میں ڈھونڈتا تھا۔۔۔۔ لیکن دوستوں کو قدم قدم اُداسی کے راستہ پر چلتے ہوئے دیکھنا بڑا کڑوا تجربہ ہے۔۔۔۔۔

خدا ایسا آسرا

زندگی میں بہت سے دن ایسے آئے ہوئے ہیں ــــ جب ہاتھ میں پکڑی ہوئی قلم کو گلے سے لگا کر روئی ہوں "خدا ایسا آسرا تیرا" معلوم نہیں، کب اور کون کسی کا یہ بن جاتا ہے۔۔۔۔ یہ قلم میرے لیے ہمیشہ حاضر ناظر خدا ایسی رہی ہے ــــ جس کو آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں، ہاتھوں سے چھو سکتی ہوں اور ایک سنسان کاغذ کی طرح جس کے گلے لگ سکتی ہوں۔۔۔۔۔

اس کا اور اپنا رشتہ کچھ حرف، اس نظم میں بتا سکی تھی ــــ

پھر وہی ہوا، جس نے گود میں کھلایا
اور جس نے میری ماں کی، ماں کی، ماں کو جایا
کہیں دور سے آئی ــــ اور ہاتھوں کے اندر کچھ حروف لائی
"یہ نتھی، کالی لکیریں نہ جانیں
یہ لکیروں کے گچھے تیری آگ کے ساتھی۔۔۔"
اور اس طرح کہتی وہ نکل گئی آگے
تیری آگ کی عمر ان حروں کو لگے۔

نصف صدی کے عرصہ میں کچھ راہ چلتے شوق بھی لگے تھے ــــ سب سے پہلا فوٹوگرافی کا تھا۔ والد نے گھر میں ڈارک روم بنا رکھا تھا، اس لیے فلمیں دھوتے تھے، اور نیگیٹو سے پازیٹو بنانے وقت ــــ خالی کاغذوں پر ابھرتے، تابناک چہرے ــــ ایک دنیا تخلیق کرنے ایسے لگتے تھے۔ کچھ عرصہ اس شوق نے دل پر قبضہ کیے رکھا پھر رقص نے دل اور توجہ کھینچ لی۔ لاہور میں تارا چوہدری سے قریب چھ آٹھ مہینے سکھلاتی لیتی رہی۔ لیکن جب تارا نے سٹیج پر اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی تو گھر سے اجازت نہیں ملی۔ شوق مرجھا گیا۔ یہ خشک پتوں کی طرح جھڑ کر زمین پر گرا تو ایک نئے بیج کی شکل میں پنپ اٹھا ــــ ستار بجانے کا شوق۔ ہندوستان کی تقسیم تک

یہ شوق بڑی کھلی ہوئی صورت میں تھا۔ لاہور ریڈیو پر کئی بار ستار بجائی ——— ماسٹر رام رکھا سراج احمد اور فیمنا ستار یا میرے استاد رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹینس کھیلنے کی بھی لگن لگی تھی۔ لاہور لارنس گارڈن کے عقبی لان میں روز ٹینس سیکھتی تھی۔ لیکن ملک کی تقسیم ہوتے ہی یہ سارے شوق میرے لیے اجنبی ہو گئے۔ ان کے لیے جس طرح کی فرصت اور جس قسم کی سہولتوں کی ضرورت تھی، ان کے لیے زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، اس لیے یہ شوق بیگانہ ہو گئے۔

سامنے ——— غم روزگار تھا۔ اچانک زندھاوا صاحب کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں ملاقات ہوئی، تو انھوں نے دہلی ریڈیو کے سٹیشن ڈائرکٹر کو خط لکھ کر ملازمت دلا دی۔ بارہ سال یہ ملازمت کی . . . .

اس ملازمت کے پہلے برسوں میں کانٹریکٹ روزانہ حساب پر ہوتا تھا، پانچ روپے روز کے حساب۔ جس دن بیمار ہو جاؤں، چھٹی لے لوں، اس دن کے پیسے کاٹ لیے جاتے تھے۔ اس لیے بیمار ہونے کا بھی جسم کو حق نہیں تھا دے سکتی۔ کبھی کبھی بخار اور زکام سے آواز روندھ جاتی تو دشواری بن جاتی۔ آج یاد آیا ہے ——— میرے شیڈیولنگ کا مبر ایک کوئیگ، کمار ہوتا تھا۔ میری اس طرح کی حالت کے وقت اس نے میری جگہ اناؤنس کرنا ہوتا تھا۔ لمبی اناؤنسمنٹ وہ کر دیا کرتا، لیکن بہت چھوٹی اناؤنسمنٹ مجھ سے کروا دیتا تاکہ اس دن کی رپورٹ میں غلطی بھی کچھ نہ درج کرنا پڑے اور اس دن کے میرے پانچ روپے بھی مجھے مل جائیں . . . .

دیکھا ——— زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتی تھی ——— وہ میری قلم تھی۔ چاہے کوئی حادثہ میری اکیلی چھاتی پر گزرتا، چاہے ملک کی تقسیم ایسا لاکھوں لوگوں کو پیش آتا، یہ قلم میرے اعضا کی مانند میرا حصہ، بدن بن کے رہتی تھی۔ سو صرف یہی، زندگی، کا فیصلہ تھا۔ باقی سارے شوق گویا کھاد بن کر اس کے رگ و ریشے میں سما گئے۔

معلوم نہیں، زندگی میں کون سی مہک کی خاطر کیا کیا کھاد بنتا ہے . . . . ساحر ——— کی دوستی بھی محسوس ہوتا ہے، ——— امروز کی دوستی کے پھول میں کہیں شامل ہے، چاہے کھاد بن کر اس کو زرخیز بنانے کی صورت میں!

کچھ عرصہ ہوا — دو تین سال پہلے — ساحر سے ملاقات ہوئی تو اس
کا تقاضا ایسا خوبصورت تھا، دو دن اس کے گھر رہی۔ واپس آکر دو نظمیں لکھیں
"کئی برسوں کے بعد اچانک ایک ملاقات، اور دونو کی ایک جان ایک نظم کی طرح کانپی
....." لیکن اس کانپتی خوبصورتی کے باوجود بھی، وہ حالت میں نے صرف امروز کے
ساتھ دیکھی ہے جس میں اس کے یہ کہنے پر "میں ۱۹۶۰ کا تمہارا قصوروار ہوں، یہ ۱۹۶۰ء ۷۰
کا سال میرا بچپن تھا، میرا قصور تھا" — اور گو میں نے اس کے قصور کی درد میں سے
جنم جلی، جیسی کئی نظمیں لکھی تھیں، آج متانت کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہوں، "یہ اتنے
اور میرے قصور بانٹے ہوئے تھوڑے ہیں!"

یہ آج، ہے۔ پتہ نہیں، کتنے، کل، اس کی کھاد بنے ہیں....

یہ آج، میری عمر جتنا بڑا ہو، یہ چاہ کر سکتی ہوں، لیکن اگر یہ کسی روز کل نہ بننا چاہے،
تو بھی محسوس ہوتا ہے، — کہہ سکوں گی "ہمارے قصور بنتے ہوئے نہیں ہیں!"
اس آج کی کوئی بھی کل نہ ہو، تو بھی اس کے معانی کم نہیں ہوتے!

امروز مجھ سے ساڑھے چھ سال چھوٹا ہے، مجھ سے دھوپ اور بارش
اب برداشت نہیں ہوتے، لیکن اس کو یہ کوئی فرق نہیں ڈالتے۔ کئی بار ہنس کر کہتی
ہوں — خدا ایک جوانی تو سب کو دیتا ہے، لیکن مجھ کو اس نے دو دی ہیں۔
میری ختم ہو گئی تو دوسری اس نے مجھے امروز کی صورت میں دے دی۔ جس کے حصہ
میں دو جوانیاں آئیں، اس کے آج، کو کل کا کیا غم ہو سکتا ہے،

جب، روزی، نظم لکھی تھی "دہ ہوئی کھانا سوئی کھانا، نہ کوئی چسکا کل دا بچیا، نہ کوئی
بھرا جھلک واسطے" اس وقت اس آج، کی آنکھوں میں کرب کی سرخ دھاریاں
تھیں۔ اس تقدیر کو قبول کیا تھا، لیکن دانتوں تلے ہونٹ چبا کر!

آج یہ تقدیر دل کی طبعی سکون کی حالت ہے....

اب، جس لمحے بھی، سب کچھ سے رخصت ہونا پڑے، پرسکون دل کے ساتھ
رخصت ہو سکتی ہوں۔ صرف چاہتی ہوں — جن کا میرے ہونے جینے سے کوئی واسطہ
نہیں تھا، ان کا میری موت سے بھی کوئی واسطہ نہ ہو۔ اس طرح کے مواقع پر اکثر وہ لوگ
گرد اکٹھے ہوتے ہیں جو لمحہ بھر کا بھی ساتھ نہیں ہوتے صرف مجمع ہوتے ہیں۔ مجمع کا

میری زندگی سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ چاہتی ہوں، اس کا یہ بی موت سے بھی کوئی واسطہ نہ ہو۔ رسم و رواج کبھی بھی میرے کچھ نہیں تھے۔ وہ کسی سوگ یا ماتمی جلسے کی صورت میں اس وقت بھی کچھ جھوٹ سچ بولنے کی تکلیف نہ کریں۔

پنجابی کا کوئی اخبار، رسالہ ایسا نہ تھا جس کو کھولتے وقت مجھے یہ پتہ نہیں ہوتا تھا ۔۔۔ کہ اس میں کس نے کیا۔ خلاف اگلا ہوگا دکھی جو مجھ سے پہلے امروز کے ہاتھ لگ جاتے تھے، وہ مجھ سے چھپا کر ان کو پھاڑ ڈالتا تھا۔ اس کا کچھ ذکر ۔۔۔ میرے ناول "دلی کی گلیاں" میں آیا تھا۔ اس میں امروز، ناصر کی صورت میں تھا) اور میری موت کے بعد انہی اخباروں کے ماتم ایک بہت بڑا دروغ ہوں گے۔ اور میں سمجھتی ہوں ۔۔۔ کسی کی لاش کے پاس اگر کوئی گل و برگ نہیں رکھ سکتا، تو اس کو دروغ ایسی شے رکھنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ امروز نے حقی الواسع زندگی میں بھی ان جھوٹوں سے بچایا تھا، اسی کو کہہ سکتی ہوں ۔۔۔ کہ وہ کسی جھوٹ کو میری لاش کے قریب نہ پھٹکنے دے ....

میری مٹی کو صرف میرے بچوں کے اور امروز کے ہاتھ کافی ہیں ....

صرف کافی نہیں غنیمت ہیں ....

مری ہوئی مٹی کے پاس کسی زمانہ میں لوگ پانی کے گھڑے یا رسم کی چیزیں رکھا کرتے تھے۔ ایسی کسی ضرورت میں میرا کوئی اعتقاد نہیں ۔۔۔ تاہم ہر چیز کے پیچھے اعتقاد ضرور کچھ نہیں ہوتا ۔۔۔ چاہتی ہوں، امروز میری مٹی کے پاس میری قلم رکھ دے!

ایرک ہارٹ کے لفظوں میں، انسان خدا کی نامکمل تخلیق ہے، اور اس کی ہر جدوجہد خدا کے نامکمل چھوڑے ہوئے کام کو تکمیل تک لے جانے کی سعی ہوتی ہے۔ کبھی اپنے ایک ناول کے بارہ میں کچھ سطریں لکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا ۔۔۔ "یہ اپنے سے آگے اپنے تک پہنچنے کا سفر ہے" آج ایرک ہارٹ کو پڑھتے ہوئے ہی محسوس ہوا ۔۔۔ یہ اپنے سے آگے تک پہنچنے کی کوشش شاید ادھورے خود کو کچھ نہ کچھ مکمل کرنے کی ہی سعی تھی .... اسی لیے جو قلم اس سارے راستے میں میرے ہمراہ رہی، چاہتی ہوں ۔۔۔ گوشت پوست کے مٹی بننے کی حد تک میرے ساتھ رہے!

چھوٹا سچ، بڑا سچ

روز صبح، پیڑ پودوں کو پانی دینا میرے سب سے پیارے کاموں میں شامل ہے، روز سویرے جتنی دیر پانی دیتی ہوں، امروز ہاتھ میں صبح کا اخبار لیے ساتھ ساتھ خبریں سناتا ہے۔ پہلے اگلے صحن میں، پھر پچھلے، اور پھر درمیانی صحن میں۔ ایک روز پیڑ کے گرد لگایا منی پلانٹ امروز کو دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "دیکھو تو، یہ منی پلانٹ کیسے بیلوں کی طرح بڑھ گیا ہے" اور اس نے جواب دیا۔ "تم نے تو پانی دے کر وارث شاہ کی بیل کو بھی بالیدگی عطا کر دی ہے، یہ تو صرف منی پلانٹ ہے!"

کبھی کبھی مسرت اور دل گیری اکٹھے یکبارگی آجاتی ہیں۔ کہا ــــ "وارث شاہ کی بیل کو دل کا پانی دیا تھا، دل کا بھی، آنسوؤں کا بھی . . . . لیکن یاد ہے وہ وقت، جب تمہارے پہلے میل سے چاروں طرف یہ خبر پھیلی تھی، جالندھر میں کسی مجلس کی صدارت کے لیے میرا نام پیش ہوا تو کمیونسٹ پارٹی کے ایک رہنما نے کہا تھا ــــ "نہیں، ہم اس کو نہیں بلائیں گے۔ اس کی بدنامی سے ہماری انجمن بدنام ہو جائے گی۔" اسی شام دہلی خالصہ کالج نے مجھے ریسیپشن دی، بعد، دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری ملنے کے سلسلہ میں۔ دل میں وہی صبح والا ماحول تھا۔ ان کا شکریہ ادا کر کے کہا ادیب ہر حالت میں ادیب ہے، موسم چاہے شہرت کا ہو، چاہے گمنامی کا، یا بدنامی کا . . . . .

اب ــــ وقت پا کر، شہرت کو، گمنامی کو اور بدنامی کو زندگی کے موسم کہہ سکتی ہوں۔ تسلی بھی ہے کہ سارے موسم دیکھے ہیں۔ لیکن کئی برس پہلے ان موسموں میں سے گذرنا بڑا دشوار معلوم ہوتا تھا۔

زندگی، امروز کے ساتھ میں، ہموار شے نہیں — یہ بے شمار بلندیوں اور پستیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں دو خودیاں — ملتی ہیں اور ٹکراتی ہیں۔ دریاؤں کے پانیوں کی طرح ملتیں، اور دو چٹانوں کی طرح ٹکراتی۔ لیکن چودہ برس کے (رام بن باس جتنے برسوں کے) تجربے کے بعد کہہ سکتی ہوں کہ اس راستے کی پستیاں چھوٹا سچ ہیں اور اس راستے کی بلندیاں بڑا سچ ہیں

امروز کی شخصیت دریا کی روانی ایسی ہے، جس طرح دریا ایک حد قبول کرتا ہے، لیکن نہر ایسی پختہ اور ٹھوس حد نہیں، وہ چاہے تو اپنے بہنے کا رخ بدل سکتا ہے۔ امروز کے لیے کوئی رشتہ صرف اس وقت تک رشتہ ہے جب تک وہ بندش نہیں۔ رشتے اکثر اپنے طبعی آزاد روپ میں نہیں ہوتے — کبھی ان کی تکمیل قانون نے تھامی ہوتی ہے اور کبھی سماجی فرائض نے۔ لیکن امروز کے لفظوں میں — "اگر راہ اپنا ہے تو راہداری کی کیا حاجت؟ — ہر قانون راہداری ہوتا ہے۔ امروز کو راہداری اپنے راہ کی توہین معلوم ہوتی ہے۔

مجھ پر اس کے پہلے ملن کا اثر — میرے بدن کی تیز حرارت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دل میں کچھ ڈوبا، اور زور کا بخار آ گیا۔ اس روز — اس شام، اس نے پہلی بار اپنی ہتھیلی کے ساتھ میری پیشانی کو چھوا — "بہت بخار ہے؟" لفظوں کے بعد اس کے منہ سے صرف ایک ہی فقرہ ادا ہوا تھا۔ "آج ایک دن میں میں کئی سال بڑا ہو گیا ہوں!"

امروز مجھ سے ساڑھے چھ سال چھوٹا ہے۔ لیکن اس روز، — اس پہلے ملن کے روز — وہ جب دفعتہً کئی سال بڑا ہو گیا، تو اتنا قدآور ہو گیا کہ اپنی اور میری تنہائی کو ماپ کر وہ اکثر کہتے لگ پڑا — "نہیں، اور کوئی نہیں، اور کوئی بھی نہیں، تم میری بیٹی ہو، اور میں تمہارا بیٹا ہوں!"

اور جہاں تک اس کی دوستی کے راستہ میں آنے والی پستیوں کا سوال ہے، — ان کی وجوہ بالکل حقیر ہوتی ہیں، لیکن اس سے پیدا ہوا اس کا غصہ اور میری اداسی — تقریباً تین گھنٹوں کے عرصہ کے لیے بڑے گہرے ہو جاتے ہیں، اس قدر عمیق کہ تنہائی آخری سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ وجوہ ہوتی ہیں — ڈرائنگ روم کی گندگی

الٹی کیوں پڑی ہوئی ہے؟ . . . . سگریٹ کا خالی پیکیٹ دیوان پر کیوں گرا پڑا ہے؟ . . . . گوند کی بوتل کو جس میز سے اٹھایا تھا، اس کے بجائے دوسرے کمرے کی میز پر کیوں رکھ دیا؟ . . . . اگر کار باہر نکالی تھی تو گیراج کا شٹر کیوں نہیں بند کیا؟ ——— اور نوبت یہ آجاتی ہے، ہاتھ کا لقمہ ہاتھ میں! . . . . اور سامنے پلیٹ میں رکھی ہوئی چپاتی پلیٹ میں پڑی رہ جاتی ہے۔ گھڑی کی سوئی ایک ہی مقام پر اڑ جاتی ہے۔ ایک خاموشی چھا جاتی ہے، جس میں صرف ایک ہی کھڑاک، بہت اونچا، ایک بار سنائی دیتا ہے ——— کہ اس کے کمرے کا دروازہ دھم سے بند ہو جاتا ہے۔

قریب تین گھنٹے اس طرح گذرتے ہیں جیسے وقت کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا ہو، اور نیچے کا سانس نیچے۔ پھر امروز کے ایک حسین ترجملے کے ساتھ یہ سکوت ٹوٹتا ہے "میں تیرا اسیس آسن، تو میرا پرانا یام!"

اسی لیے ان سب ڈھلوانوں۔ پسینوں کو چھوٹا سچ کہہ سکتی ہوں اور اس کی ہستی کو بڑا سچ!

ہندی شاعر کیلاش باجپئی کو علم جیوتش کی گہری واقفیت ہے، ایک روز کیلاش نے کہا ——— "امرتا! تمہارے جنم کے وقت چاند تمہاری قسمت کے خانہ میں بیٹھا ہوا تھا" میں ہنس رہی تھی۔ "لیکن وہ تو اڑھائی گھڑی بیٹھ کر چلا گیا ہوگا . . . ." کہ پاس سے ہنس کر امروز نے کہا ——— "وہ کوئی امروز تھوڑے ہی تھا، جو پھر کہیں نہ جاتا، وہ صرف چاند تھا۔ آیا بیٹھا اور پھر اٹھ کر چلا گیا ——— چاند نے تو گھر گھر جانا ہوتا ہے . . . ."

یاد آرہا ہے ——— ایک روز بیماری کی حالت میں میں نے امروز سے کہا ——— "میں اس دنیا سے چلی گئی تو تم اکیلے نہ رہنا، دنیا کا حسن بھی دیکھنا اور شباب بھی!" تو امروز نے غصہ سے بل کھا کر کہا ——— "میں پارسی نہیں، جس کی لاش کو گدھوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ مجھے گدھ نہیں چاہیئے۔ تم میرے ساتھ اور دس برس جینے کا وعدہ کرو۔ میری ایک حسرت ابھی باقی ہے کہ میں ایک عمدہ فلم تخلیق کرلوں۔ بس، وہ بنا کر پھر اکٹھے اس دنیا سے وداع ہوں گے!"

یہ لفظ جس شدت سے کہے گئے۔ اس لمحے اس سے بڑا سچ اور کوئی نہیں تھا۔ اسی لیے کہتی ہوں ——— زندگی کی ساری دشواریاں چھوٹے سچ میں، اور اس کا ساتھ بڑا

بہ سچ ہے . . . . .

یہ بڑا سچ ــــ کبھی ہنسی مذاق کے پھولوں ایسے رَو میں بھی جھوٹا نہیں ہوا۔ ایک بار مجھے اور امروز کو چائے پینے کی طلب تھی۔ امروز نے کہا۔ "اچھا، تم گیس پہ چائے کا پانی چڑھا دو، آج میں چائے بناؤں گا۔" ــــ میں گرم سی ہوئی بستر میں بیٹھی ہوئی تھی اٹھنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ کہا "میرے نواب تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں، جینے کے، لیکن جتنے بھی رہتے ہیں، اب میں نے اس طرح جینے ہیں۔ جیسے خدا کی بارات میں آئی ہوئی ہوں۔" ــــ امروز ثانیہ بھر خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔ "لیکن میں بھی تو خدا کے بیاہ پر آیا ہوں۔" ــــ مجھے ہنسی آ گئی "ہاں، لیکن تم لڑکی والوں کی طرف سے ہو۔" ــــ میں لڑکے والوں کی طرف سے ہوں۔" ــــ اس دن سے روز کا ایک مذاق چل پڑا۔ بات بات میں امروز کہہ دیتا "اچھا جی! یہ بھی کام ہم ہی کئے دیتے ہیں ــــ ہم لڑکی والوں کی طرف جو ہوئے ــــ "آپ بیٹھے رہیئے، لڑکے والو!"

سچ ــــ امروز کی دوستی میں جیسے میں نے سچ مچ خدا کی بارات دیکھی ہو . . شادی بیاہ پر ہونے والے شریک والوں کے جھگڑے بھی دیکھے ہیں، لیکن بیاہ بھی . . .

کھانا بنانے والا نوکر کبھی میرے لیے ضروری ہوتا تھا، اتنا کہ نوکر کو کبھی بخار آتا معلوم ہو تو گھبرا کر سوچتی تھی ــــ خدایا، مجھے بخار آ جائے لیکن نوکر کو نہ آئے، ورنہ کھانا مجھے بنانا پڑے گا . . . . لیکن گذشتہ سولہ سترہ برس سے کوئی نوکر میری ضرورت نہیں رہا (اپنے ہاتھ سے کھانا بنانے کی عادت مجھے اندر بیٹھا جا کر پڑی۔ سوبھا سنگھ جی کو میں اور امروز ملنے گئے تھے۔ لیکن ہمارے کھانے کا سارا بار جب سوبھا سنگھ جی کی اہلیہ پر پڑ گیا، تو اچھا نہیں لگا۔ میں نے کوشش کی، تو مجھ سے لکڑیوں کی آگ نہیں تھی جلتی۔ لیکن امروز نے پھونکیں مار مار کر جب آگ جلانے کا ذمہ لے لیا، تو میں نے کھانا بنانے کی ذمہ داری اٹھا لی، اور پھر واپس آ کر نوکر ایک دخل اندازی محسوس ہونے لگا) سو گذشتہ سولہ سترہ سال سے روٹی اپنے ہاتھ سے بناتی ہوں۔ کمروں کی اور برتنوں کی صفائی کے لیے، پارٹ ٹائم، انتظام ہے اس سے زیادہ مجھے کسی نوکر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن یہ پارٹ ٹائم والا کبھی بیمار ہو، چھٹی پر ہو، تو برتن بھی خود ہی صاف کر لیتی ہوں۔ ایسے موقعہ پر میں برتن مانجھتی ہوں اور امروز پاس کھڑا ہو کر مجھے گرم پانی دئے جاتا ہے، میں برتن دھوئے جاتی ہوں۔ ــــ اور

جب وہ کبھی سٹوڈیو میں پینٹ کر رہا ہوتا ہے، میں اس کو اٹھنے نہیں دیتی، خود ہی برتنوں والا کام ختم کر کے ——— آواز دے دیتی ہوں — "لو لڑکی والو! آج تو لڑکے والوں نے برتن بھی مانجھ دئے ہیں ———" اور جیسے یہ مذاق ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، اس طرح ایک جوش، ایک امنگ بھی ہم نے اپنے لیے محفوظ رکھی ہوئی ہے ——— امروز کا پیشہ بہت گراں ہے۔ کینوس بھی گراں اور رنگ بھی۔ جب کبھی اس کے پاس نئی کینوس خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں تو کہتی ہوں "تمہاری پہلی پینٹنگ میں نے خرید لی، یہ لو پیسے! ——— تم نئی کینوس خرید لو اور پینٹ کر لو!" اور جب کبھی مجھ کو میری کتابوں سے پیسے نہ مل رہے ہوں، میں دلگیر ہوں تو وہ کہتا ہے ——— "چلو آج میں نے تمہاری فلاں کہانی پر فلم بنانے کا حق خرید لیا۔ یہ لو سائننگ اماؤنٹ" اور اس کے فلمی حقوق مجھے بیچ دو!" معلوم ہے ——— پیسے اس کے پاس ہوں یا میرے پاس، رہتے اتنے کے اتنے ہی ہیں ——— لیکن ہم وقت پر اس دن کی امنگ ضرور کما لیتے ہیں اور یوں ہر مشکل دن کو آسان بنا لیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اتنا بڑا سچ بن جاتا ہے ——— کہ پیسوں کی کمی جھوٹا سچ بن جاتی ہے۔

میں صرف دل میں نہیں، ٹرنکوں، الماریوں میں ——— بھی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنبھال رکھتی ہوں ——— کسی جنم دن پر کوئی تحفہ دینا ہو، میرے ٹرنکوں اور الماریوں میں سے کچھ نہ کچھ ضرور نکل آتا ہے۔ اچانک کچھ خریدنا پڑ جائے، بنک کے کسی نہ کسی اکاؤنٹ میں سے وہ رقم بھی مل جاتی ہے، ایسے وقت بھوک لگ جائے، فرج میں سے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔ امروز اس بات پر بڑا ہنستا ہے۔ ایک بار ہنستا ہنستا کہنے لگا "——— تم نے میرا بھی کچھ حصہ کہیں بچا کر ضرور رکھا ہوگا کہ اگلے جنم میں کام آئے گا . . ."

اگلے کا پتہ نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے، پچھلے جنم میں ضرور کچھ پس انداز کر کے رکھا تھا، جو اس جنم ——— انتہا کے رنگ، زاویہ لیں ——— میں دل بھر کر پانی کے کٹورے کی طرح پی سکی ہوں۔ اور سوچتی ہوں ——— خدا کرے، اس کی بات بھی صحیح ہو جائے، اور میں اس کو کچھ کہیں سے، اپنے اگلے جنم کے لیے بھی بچا کے رکھ سکوں . . .

ایک نظم کی تشریح

۵ ستمبر ۱۹۷۲ کی رات تھی۔ شب کے ساڑھے دس بجے تھے، میں کازان زاکس

کی کتاب ڈارک گارڈن، پڑھ رہی تھی کہ ٹیلی فون آیا ——— ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کہہ رہے تھے ——— "صبح سینیٹ کی میٹنگ ہے، جس میں تمہاری کہانی 'ایک شہر کی موت' کے خلاف ریزولیوشن پاس ہونا ہے۔ میں تمہارے والد کا دوست ہوا کرتا تھا، ان کی عزت کرتا تھا، اس لیے تم کو فون کر رہا ہوں کہ تمہاری کہانی، ایک شہر کی موت، کے ساتھ تمہاری تحریر کی موت ہو گئی ہے!"

میں نے یہ موت کی خبر سنی۔ وائس چانسلر سچ مچ اس موت پر افسوس کر رہے تھے، اس لیے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے پوچھا ——— "آپ نے یہ کہانی پڑھی ہے؟"

"نہیں، مجھے لٹریچر کے بارہ میں زیادہ علم نہیں، میں تو سائنس کا آدمی ہوں"

"آپ کو لٹریچر کے بارہ میں علم نہیں، تو بھی آپ کی فراست پر اعتماد کر کے کہنا چاہتی ہوں ——— آپ ایک بار اس کہانی کو پڑھیں!"

"میرے پاس اس کے سناپسز آئے ہیں، وہ بہت برے ہیں"

"سناپسز، ہو سکتا ہے، صحیح نہ ہوں"

"سناپسز کیسے غلط ہو سکتے ہیں؟"

"کوئی پریجوڈِسڈ مائنڈ لکھے تو وہ غلط ہو سکتے ہیں"

"ہاں، یہ صحیح ہے، تاہم ...."

"جب کہانی موجود ہے تو اس کو پڑھنے کی تکلیف گوارا کی جا سکتی ہے"

"ہمارا کوئی آدمی، شاید رجسٹرار، اگر دلی آئے تو اس کو وقت دے دینا، اس کے ساتھ کہانی کو ڈسکس کر لینا!"

"اگر آپ خود پڑھیں، تو مجھے فون کیجیے، میں کہانی کو آپ کے ساتھ ڈسکس کر سکتی ہوں"

"اچھا، آئندہ ہفتہ فون کروں گا۔ آج میں نے بے وقت فون کیا ہے۔ اصل میں میں تمہارے والد کا احترام کرتا تھا، وہ بڑے بلند خیال انسان تھے، تمہاری عزت بھی کرنا چاہتا ہوں ...."

"لیکن وہ مجھے پڑھے بغیر نہیں ہو سکتا ...."

"تم ایسا لکھو کہ ہم تمہاری عزت کر سکیں"

"فکر نہ کیجئے۔ جب تک میری نگاہوں میں میری عزت ہے، میرے ناموس پر حرف نہیں آسکتا"

میری طرح میری عزت نے بھی ساری عمر کسی پر انحصار نہیں رکھا۔ فون بند ہوگیا، تو وہ بھی میری طرح ہنس رہی تھی۔ چار قدم پر کمرہ اامروز فون کی بابت چیت کو سن رہا تھا۔ زور سے ہنس پڑا۔ کہنے لگا "ریزولیوشن کاموں کی تعمیر کے بارہ میں بنے تھے، ان لوگوں نے ریزولیوشنوں کو کس کام پر لگا دیا! یہ اس قسم کے ریزولیوشن پاس کریں گے تو ریزولیوشن لفظ کی ہتک کریں گے، تمہیں کیا؟"

ان دنوں اس کہانی کو سرتیج کوہلی اک اس کتاب کے لیے انگریزی میں تبدیل کر رہا تھا جس میں ہندوستان کی کچھ کہانیوں کا انتخاب شائع ہونا تھا۔ بھارتی گیان پیٹھ کی طرف سے میرے سیلیکٹڈ ورکس چھپ رہے تھے —— اس کے لیے بھی یہ کہانی چنی گئی تھی، اور راج پال کی طرف سے میری کہانیوں کی "پنجاب سے باہر کے کردار" کے نام سے جو کتاب شائع ہو رہی تھی —— اس کی اہم کہانی یہی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اگر نہ بھی ہوتا، تو بھی مجھے معلوم تھا کہ یہ کہانی میری بہترین کہانیوں میں سے ہے —— اور جس کے لکھ سکنے کی میری تسلی کو کسی یونیورسٹی کا ریزولیوشن کم نہیں کر سکتا۔

اداسی یہ نہیں تھی —— لیکن دل اداس تھا۔ دل گیریوں کا ایک طویل سلسلہ تھا —— سو جس روز ہاتھ میں قلم پکڑی تھی، اسی روز سے میرے ساتھ چل پڑا تھا —— اور پھر ہمیشہ میرے ساتھ چلتا رہا۔

پھر ان دنوں دلویندر ستیارتھی صاحب کا ہمیشہ کی طرح میرے متعلق "درشٹی" میں ایک سکینڈلس مضمون شائع ہوا۔ ستیارتھی صاحب زندگی میں میرے کبھی بھی زیادہ شناسا نہیں رہے، لیکن وہ جب بھی کبھی میرے بارہ میں لکھتے رہے، معلوم نہیں کس نفسیاتی الجھن اور کرب میں بھٹک کر لکھتے رہے۔ خیر —— پنجابی میں کئی دلویندر ستیارتھی ہیں جن کو کسی کی روح کی پاکیزگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ سو اس مضمون کا بھی اثر تھا، صرف اس مضمون کا نہیں تھا۔ لیکن یہ آزردگی کے سلسلہ کو جاری رکھنے والی ایک چھوٹی سی کڑی ضرور تھی۔ اس لیے آزردگی اور طویل ہوگئی اور اداسیوں کے اس سلسلے سے تنگ آکر میں نے ایک نظم لکھی —— الوداع!

کسی نظم کی تشریح کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن سوچتی ہوں، ـــــ یہ نظم ایک تشریح مانگتی ہے، کیونکہ یہ نظم اتنی اِن ڈائریکٹ ہے، ـــــ کہ بظاہر صرف ایک انسان سے علاقہ رکھتی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کا باطنی چہرہ ایک انسان کا نہیں، پورے پنجاب کا ہے۔

پنجاب کا چہرہ میرے لیے محبوب کا چہرہ ہے، ـــــ لیکن اس محبوب کا جو غیروں کی محفل میں بیٹھا ہو، لکھا ـــــ

خدا تیری نظم جتنی تمہیں عمر دے!
میں اس نظم کا مصرعہ نہیں،
جو اور مصرعوں کے ساتھ چلتی رہوں،
اور تجھے ایک قافیے کی طرح ملتی رہوں،
میں تیری زندگی سے نکلی ہوں ـــــ چپ چاپ ـــــ اس طرح ـــــ
جیسے لفظوں میں سے معانی نکلتے،
اور بدنصیب معانی کا کیا ـــــ
ان کا ہونا بھی ان کے نکلنے ایسا
اور جیسے ایک معنی نکلا
کل کو کوئی نامراد اور معنی نکلے گا۔
لیکن نظم ایک عالم پر سلامت رہے
اور خدا تیری نظم جتنی تمہیں عمر دے!

اپنی ہستی پر مجھے فخر ہے ـــــ اگر پنجاب کی سرزمین پنجاب کی ایک نظم ہے ـــــ تو میں اس نظم کے معانی ایسی ہوں۔ معانی نکالے جاتے ہیں ـــــ آج اور معانی، کل کو کچھ اور۔ پنجاب میں اس وقت جس قسم کی دانش اور ادبی سیاست ہے، میں سچ مچ اس میں سے چپ چاپ اس کے معانی کی طرح نکل جانا چاہتی ہوں۔ اور کل کو، مجھے معلوم ہے، میری طرح اس کے معانی ایسے اور ادیب بھی اس میں نکل جائیں گے۔ ـــــ نکالے جائیں گے۔

نظم ایسی سرزمین سلامت رہے، پنجاب سلامت رہے، میری تمنا صرف چپ چاپ اس میں سے نکل جانے کی ہے ـــــ اسی لیے یہ الوداع لکھی۔

ققنوسی نسل

تاریخ بتلاتی ہے کہ ققنس (فقنس) کے ساتھ اپنے تئیں مشابہت دیتی نسل نے اپنا نام فینیشین رکھا تھا۔ ققنس پھر اپنی راکھ میں سے جنم لیتا ہے —— انسان کی جس نسل نے بربادی میں سے نکل سکنے کی اپنی طاقت کو پہچانا —— اپنا نام جل مرتے اور اپنی راکھ میں سے پھر پیدا ہونے ققنس کے ساتھ وابستہ کر لیا۔

یہ ققنس سورج کی عبادت سے متعلق ہے، سورج جو روز غروب ہوتا ہے اور روز طلوع ہوتا ہے۔ اور یہ فینیشینز، جن کی آبائی سرزمین کا آج تک تاریخ کو سراغ نہیں ملا، چاہے ان کا تعلق سمرقند اور ہندوستان کے ساتھ ڈھونڈتے ہیں، ہمیشہ سورج کی عبادت کرتے تھے۔ 'ادن' سورج کا ایک نام تھا، اسی لیے فنیقی لوگوں نے جب یورپ میں نئی سرزمین تلاش کی تو اس کا نام این۔ ادن۔ ڈون (آفتاب کا شہر) رکھا، جو آج لنڈن ہے

اِزرائیل کے جب بارہ قبیلے منتشر ہوئے تھے، معلوم ہوتا ہے، ان میں سے بھی کچھ لوگ فنیقیوں سے مل گئے تھے کیونکہ لفظ انگلینڈ کی جڑیں ہیبرو زبان میں ہیں۔ جوزف قبیلہ کا نشان بیل ہوتا تھا۔ بیل کے لیے ہیبرو میں ایگل لفظ آتا ہے۔ نئی ہی سرزمین کو ان لوگوں نے اینگل لینڈ کا نام دیا، جو آج انگلینڈ ہے۔

میرے خیالات کا تاریخ کے ساتھ صرف اسی قدر تعلق ہے کہ جس نسل نے فنیقیوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا تھا، وہ رشتہ مجھے بڑا اپنا اور پہچانا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ فنیقی نسل کو میں اپنی زبان میں ققنوسی نسل کہہ سکتی ہوں۔ دنیا کے سب سچے ادیب مجھے ققنوسی نسل کے معلوم ہوتے ہیں، تخلیقی عمل کی آگ میں جلتے، اور پھر اپنی راکھ میں سے تخلیق کی صورت میں پیدا ہوتے!

بہت برس ہوئے —— 'سورج اور میں' نام کے مضمون میں میں نے لکھا تھا —— سورج کے ڈوبنے سے میرا روز کچھ ڈوبتا ہے، اور اس کے پھر آسمان پر نمودار ہونے سے میرا روز کچھ آسمان پر چڑھتا ہے۔ رات میرے لیے ہمیشہ اندھیرے کے ایک چناب ایسی رہی ہے —— جس کو روز اس لیے تیرنا ہوتا ہے کہ اس کے اُس پار سورج ہے!" اور لکھا تھا۔" یہ سب شعوری طور پر نہیں ہوا۔ کب ہوا، کیوں ہوا؟ پتہ نہیں۔

میں نے صرف اس کو شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یاد ہے —— بہت چھوٹی
تھی، جب آفتاب کے غروب ہونے کے وقت اچانک رونے لگ جاتی تھی۔ ماں
کبھی پیار دیتی، کبھی گھڑکتی اور کبھی مجھے سہلا کر سلا دیتی، اس کا علاج ڈھونڈ کر دیتی تھی" —— بس
آنکھیں میچی "سورج آیا" اس سے روز میرا سوال ہوتا تھا —— "لیکن سورج ڈوبا کیوں؟"

سورج کا ذکر پھیر پھیر میری نظموں میں آتا رہا۔ صرف ۱۹۷۴ء میں میں نے شعوری طور پر
پرانی تحریریں پڑھیں، دیکھا —— کہ یہ ذکر کیسے کیسے آتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے وقت جبری اٹھائی گئی عورتوں کی کوکھ سے پیدا ہوئے
"مجبور" بچے کی زبان سے ایک نظم لکھی تھی —— میرا خیال ہے کہ سورج کا پہلا اور تگڑا
ذکر اس میں آیا تھا ——

لعنت ہوں میں وہ، جو انسان پر پڑ رہی
پیدائش ہوں اس وقت کی، جب ٹوٹ رہے تھے تارے
جب بجھ گیا تھا سورج . . .

اس سال ملک کی آزادی کے ساتھ بڑے خواب جوڑ کر نظم لکھی تھی —— "میں تواریخ
ہوں ہند کی —" اور آزادی کے جشن کے لیے کہا تھا ——

چاند جو جھکا عرش سے، اس کو کہے سلام!
سورج اٹھا آسمان سے، اس کو کرے سلام!

نجی محبت کی بھرپور شدت میں نے ۱۹۵۲ء میں دیکھی تھی —— اس وقت کی
نظموں میں سورج کا ذکر اس طرح تھا۔

چاند سے سپید اعضا، زمین کے
سب کرنوں نے سورج سے رنگ قرمزی دھویا . . .
گھول کر سورج ہم نے —— زمین کو ڈبو لیا . . .
پورب نے کچھ پا لیا، کون سے عرش ٹٹول
ہاتھ کٹورا دودھ کا، اس میں کیسر دیا گھول . . .
سورج نے آج مہندی گھول دی ——
ہتھیلیوں پر رنگی گئیں، آج دونو تقدیریں . . .

یہ سورج، کیسر دالے دودھ کے کٹورے کی صورت میں، اور اس کی لالی کو —— مہندی کی شکل میں، میں نے صرف اس وقت دیکھا تھا، پھر اس کا ذکر اور اس ہوتا گیا۔

ڈگمگائی سورج کی کشتی پچھم اٹھی لہر رے
گٹھڑ پوٹلی اٹھا شامیں آئیں ہماری طرف رے . . .

برسہا برس سورج جلائے، برسہا برس چاند جگائے
عرشوں سے مانگے جا کر تارے چاندی رنگ کے
کسی نے آکر شمع جلائی، گھنی تاریکیوں نے صف لپیٹی
برسوں کی اس تپّی سے، نور رہے پھر طے . . . .

آندھیاں چڑھیں پورب سے آسمان گئے یوں لد،
چڑھتا سورج تھم لیا، اجالا دبا دُھند
کالے کوس پار کرتے، دھوپ اتری یوں
سورج ہوا سرکنڈہ، کرنیں بن گئی مونج . . . .

پربھ چولہا جلایا، پھونکیں مارے صبا
کرنیں ہوئیں اونچی، جیسے نکلے کوئی شعلہ
سورج رکھیں ہانڈیاں، آٹا گوندھا دُھوپ
بڑھ بڑھ آئیں فصلیں گویا دیا بچھا کے مونڈھ
آیا آج پردیسی! کل کی جانے کون . . . . .

سورج کرلی پیٹھ ——
سب ہی تنکے سمبھال کے بھاگن باندھی گٹھ
بہہ بھی گئے تین سو پینسٹھ یوم نکل . . . . .

تمہاری آگ مبارک ہم کو —— سورج ہمرے در پہ آیا
اس نے آج اک کوئلہ مانگ کے اپنی آگ سلگائی ہے
نازک پور دلوں کے —— کرنوں سے چھوئی سوئی، پار ہو گئی . . .
یادوں نے بھڑکائی آگ —— لاکھ بجھائے پلّو آگ نہ بجھ گئی . . .
آج چاند سورج حیات کا سودا کر رہے ہیں

اڑ جانے سے دونو پڑے جھکتے ہیں
پھر ہم کو کیوں تمہاری دہلیز یاد آ گئی
آج لاکھوں خیال سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہیں . . .
کواڑ بند نہ کر اے حیات ! سفر ختم نہ ہوا ابھی
سورج بانٹے روشنی ، دھرتی سے نکلی سوگندھی
نیند کے ہونٹوں سے جیسے سپنے کی مہک آتی ہے
پہلی کرن جیسے رات کے ماتھے پر شکن لگاتی ہے . . . .
حسرت کے دھاگے جوڑ کر "سالو" ہم بنتے رہے
فراق کی ہچکی میں بھی شہنائی کو سنتے رہے . . . .
رات کی بھٹی کو کس نے جلایا
کھولتی ہے دیگ سورج کی کیسے
بات ہے دنیا کی ، دنیا والو !
دیگ میں پھر بیٹھنا ہے عشق نے . . . .
سورج کا پیڑا ایستادہ ، کرنیں کس نے توڑیں
اور چاند کا گوشہ کسی نے عرش سے آج ادھیڑا . . . .
سورج کا گھوڑا ہنہنایا ، روشنی کی کاٹھی اتر گئی
عمروں کا سفر کرتے ــــــ زمین کا مسافر رو پڑا . . . .
روشنی کی پھلکاری ، تو پاکون بھرے !
عرش کا ایک آلہ ، سورج جلا دوں
دل کی ادنچی مٹی ، دیا کون رکھے . . . .
آنکھوں پر ڈھند لیتی کس کے نقش پا کی ریت کو چومے
سورج کا طواف کرتی زمین رک گئی . . . .
نظر کے آسمان سے چل دیا ہے سورج کہیں
چاند میں لیکن اس کی خوشبو ابھی آ رہی . . . .
سورج نے کچھ گھبرا کے آج نور کی اک کھڑکی کھولی

بادل کی اک کھڑکی بند کی ، اتر گیا اندھیرے کی سیڑھی . . . .
عرش عاشق اوندھے موتہہ بیٹھا دھند کا حقہ پیتا
سورج کا ایک کوئلہ سے کر لکیریں ڈالے ، پھر بجھائے . . . .
پورب کی آج کھٹیا خالی کوئی سویر بیٹھنے نہ آئی
عرش پڑا ڈھونڈ رہا ہے ۔ زمین کی ہر خندق کھائی . . .
موتہہ میں لقمے کے بجائے ، رہ گئی لقمے کی باتیں
آسمان پہ اڑ رہی ، کالی چیلوں ایسی راتیں . . . .
سورج ایک کشتی ہے جو مغرب کی لہروں میں غرقاب ہو گئی
سورج روئی کا ایک گالہ ہے جس کو گری گھٹا نے دھنک ڈالا
سورج سرکنڈوں کا ایک جنگل ہے جو سوکھ کر کانٹا بن گئے
سورج دل کی آگ سے خالی ہے جس نے میرے دل کی آتش سے کوئلہ مانگ کر اپنی آگ سلگائی
سورج سوئیوں کی ایک پوٹلی ہے جس کی سوئیاں میری انگلیوں کے پوروں میں چبھ کر پار ہو گئیں
سورج ایک کھولتی ہوئی دیگ ہے جس میں میرے عشق نے میٹھنا ہے
سورج ایک پیڑ ہے ۔ جس سے کسی نے شعاعیں توڑ لیں
سورج ایک آسیب ہے جس پر سے روشنی کی کاٹھی اتر گئی
سورج ایک چراغ ہے جس کو آسمان کے طاق میں رکھ کر جلایا جا سکتا ہے
سورج میرے دل کی مانند ہے جو گھبرا کر اندھیرے کے زینے سے اتر جاتا ہے
سورج ایک بجھا ہوا کوئلہ ہے ۔ جس کے ساتھ آسمان تقدیر کی لکیریں کھینچتا ہے
سورج ایک امید ہے ۔ جس کے بغیر راتیں آسمان میں سیاہ چیلوں کی طرح اڑ رہی ہیں ۔ یہ سورج کی کتنی ہی صورتیں دیکھ رہی ہوں ۔ انسان میں شعور کی صورت بھی ہے ۔
دل کے آنگن میں رات پڑ گئی اس داغ کو کیسے سلاؤں
دل کے کوٹھے پہ سورج چڑھا اس داغ کو کیسے چھپاؤں . . .

ابھی فجر ہوئی ہے
چھاتی کو چھید کے، چھاتی میں سورج کی کرن پڑی ہے ....
زندگی جو سورج سے شروع ہوئی ہے، —— تمام سیاروں کو پھلانگ کر آخر میں
پھر سورج کی طرف لوٹتی ہے —— یہ عمل بھی لاشعوری طور پر رقم کیا تھا —— آج اس کو باشعور
دیکھ رہی ہوں ——

دل کے پانی لہر جو اٹھی، لہر کے پاؤں میں سفر سنا جاتا
کرنیں ہمیں بلانے آئیں، —— اب سورج کے گھر چل دے ....

ذاتی محبت کی نظموں کے علاوہ سورج اور نظموں میں بھی زبردستی آتا رہا —— جیسے ہوچی منھ
سے ملاقات پر میں نے نظم لکھی تھی ——

ویت نام کی دھرتی سے آج ہوائیں بھی پوچھ رہیں
تاریخ کے گالوں پہ سے آنسو کس نے پونچھا!
دھرتی کو آج پچھلی رات میں ایک ہرا پیلا سپنا آیا
عرش کے کھیتوں میں جا کر سورج کس نے بیجا!

اور جنگ کی ہولناک صداؤں سے ہر خود ہوئی سرزمین کی تمنا میں جو نظمیں لکھیں ——

دھرتی نے آج پوچھ بھیجا، —— کون لکھے بھیوشیہ کی لوری
کہتے ہیں —— ایک امید پڑی، کرنوں کی کوکھ میں
پورب نے پنگھوڑا جھلایا، جدی پشتی ایک پنگھوڑا
سورج پڑا رات کی کوکھ میں ....
عرض کرے رات کی دایہ ——
رات کبھی بھی بانجھ نہ ہو، اور کبھی بھی بانجھ نہ ہو ...

یہ ساری نظمیں وہ ہیں —— جو ۱۹۴۷ اور ۱۹۵۶ کے درمیانی برسوں میں لکھی تھیں۔ اس
سے اگلے تیرہ برس ہیں۔ دیکھ رہی ہوں —— ان برسوں میں بھی سورج کا ذکر موجود ہے ——

مجھے وہ وقت یاد ہے ——
جب ایک ٹکڑا دھوپ کا، سورج کی انگلی پکڑ کر
اندھیرے کا میلہ دیکھتا، بھیڑ کے بیچ کھو گیا ...

گلیوں کے کیچڑ میں سے گذر کر اگر تو آئے کہیں،
میں تیرے پاؤں دھو دوں
بنت تیرا سورج! ــــــ
کمبل کا دامن اٹھا کر میں ہڈیوں کی ٹھٹھرن گرا لوں . . .
ایک کٹوری دھوپ کی، میں لاجرعہ پی جاؤں
اور ایک ٹکڑا دھوپ کا میں کوکھ میں اپنی ڈال لوں . . . .
میں کوٹھری در کوٹھری ــــــ روز سورج پیدا کرتی
میں روز سورج پیدا کرتی، اور روز سورج یتیم ہوتا ہے . . .
اس نگر میں بھی سپنے آتے
کتنی بھی نگروں کو بند کرو، یہ پھر بھی اندر آ گھستے ہیں
کہیں سنگِ مرمر کی وادی، پتہ اس کا دے جاتے ہیں
سارا شہر ان کے سنگ ــــــ نیند میں چل پڑتا ہے
پھر راستے میں سورج کی ایڑی اس کو لگے . . . . .
ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات ــــــ
جوں بادل کا ایک ٹکڑا آج سورج کے ساتھ ٹانکا؛
ادھیڑتے تھک گئی ہوں، لیکن کچھ نہیں بنتا، اور معلوم ہوتا ہے ــــــ
کہ سورج کے لال قمیض میں یہ بادل کسی نے بُنا ہے . . .
سورج کو سارے خون معاف ہیں
دنیا کے ہر انسان کا ــــــ
وہ ہر روز "ایک دن" قتل کرتا ہے . . . .
اندھیرے کے سمندر میں، میں نے جال ڈالا تھا
کچھ کرنیں، کچھ مچھلیاں پکڑنے کے لیے
کہ جال میں پورب کا پورا سورج آگیا!
اس زمانہ کی لینن اور گورو نانک جیسی شخصیتوں پر لکھی نظموں میں سورج کا ذکر ہے ــــــ
تو میری تاریخ کا کس طرح کا کردار؟

میری دیوار کے کیلنڈر میں سے نکل کر تو روز ماس کی تاریخ بدلتا
اور مجھے اک نئے دن کی طرح ملتا ۔
کیلنڈر سے باہر آکر تو سڑکوں پر نکل پڑتا ہے
تو ایک دھوپ نکل آتی ہے ....
کچے محل کے ان روٹھے، میرا جی نہ ٹھہرے
بیٹھی بلونے لگی، اور لگا، گویا مکھن ہلا
میں نے چاٹی میں ہاتھ ڈالا تو سورج کا پیڑا نکلا . . . .
گورو نانک کی اہلیہ، سُلکھنی، کی طرف سے جو نظم لکھی —— وہ ساری کی ساری
سورج سے بھری ہوئی ہے ——
میں ایک چھاؤں تھی —— ایک چھاؤں ہوں
میں نے سورج کے سفر کے ساتھ سفر کیا، سورج کی دھوپ پی ۔
اور دھوپ کے ایک دریا میں نہائی
یہ سورج کے امتحان کا وقت تھا، اور سورج کے امتحان کا خاتمہ نہیں تھا
چھاؤں کی اس کوکھ کو ایک حکم تھا،
کہ اپنے اندھیرے میں سے اس نے کرنوں کو پیدائش دینا ہے
کرنوں کا دردِ زہ برداشت کرنا تھا ۔
اور چھاؤں کی چھاتیوں سے —— کرنوں کو دودھ پلانا تھا ۔
اور جب سورج نے کائنات کے چاروں چک گھومنے تھے، بہت دور
جانا تھا؛
تو چھاؤں نے بعد میں ——
ان بلکتی ہوئی کرنوں کو کھلانا تھا . . .
سورج کا جہاں میں نے اور بے شمار طرح سے تصوّر کیا —— وہاں اس کے
ساتھ جماع تک کو متصوّر کر گئی ——
ایک کٹوری دھوپ کی، میں لاجرعہ پی لوں
اور ایک ٹکڑا دھوپ کا، میں کوکھ کے اندر ڈال لوں . . . .

اور سورج سے ہوئے حمل میں سے سورج پیدا کرنے کی بات تک یہ ذکر پہنچا ــــــ

کوٹھڑی در کوٹھڑی، میں روز سورج پیدا کرتی . . . . .

اور روز سورج یتیم ہوتا ہے . . . . .

عبادت کی شکل میں، میں نے کبھی سورج کی عبادت نہیں کی۔ لیکن یہ کس طرح کی تڑاپ ہے ــــــ کہ اس کی ہستی کو اپنی کوکھ کے اندھیرے تک بھی لے گئی ہوں. . . .
اور اس یخ کو سلگھنی کے خیالوں میں بھی ڈال دیا . . . .

معلوم ہوتا ہے ــــــ مجھ جیسے کچھ لوگ، چاہے وہ کسی ملک میں ہوں، اور چاہے کسی صدی میں، ققنوسی نسل سے ہوتے ہیں!

کہتے ہیں ــــــ ققنس پرندہ چیل کی جسامت کا ہوتا ہے۔ اس کے پَر چمکیلے قرمزی اور سنہری ہوتے ہیں۔ اس کی آواز میں نغمگی ہوتی ہے اور یہ ہمیشہ تنہا۔ اکیلا ہوتا ہے۔ اس کی عمر کم سے کم پانچ سو سال ہوتی ہے۔ لیکن کئی اس کی عمر ایک ہزار چار سو اکسٹھ برس گردانتے ہیں۔ اس کی عمر کا ایک قیاس ستانوے ہزار دو سو سال بھی ہے۔ عمر کی میعاد جب ختم ہونے لگتی ہے ــــــ یہ مہک دار بوٹیوں کی شاخیں جمع کر کے ایک گھونسلہ بناتا ہے، اور گھونسلے میں بیٹھ کر گاتا ہے ــــــ جس سے ایک آگ پیدا ہوتی ہے، اور یہ بمعہ گھونسلے کے اس میں جل مرتا ہے۔ اس کی راکھ میں سے ایک نیا ققنس پیدا ہوتا ہے جو ساری مہکدار راکھ کو سمیٹ کر سورج کے مندر کی طرف جاتا ہے اور وہ راکھ سورج کے آگے چڑھا دیتا ہے۔

کچھ مؤرخ اس کی موت کا حال یوں بیان کرتے ہیں ــــــ کہ یہ جب زندگی کے آخری وقت کو آیا جان لیتا ہے تو خود ہی اڑ کر سورج کے مندر میں پہنچ جاتا ہے اور عبادت کی آگ میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ جب آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے ــــــ تو اس کی راکھ میں سے نیا ققنس پیدا ہو جاتا ہے۔

مصر کی قدیم تاریخ کے اس پرندے کا وطن اس سمت میں بتایا جاتا ہے، جدھر آفتاب طلوع ہوتا ہے اس لیے مؤرخ اس پرندے کا آبائی وطن عرب یا ہندوستان سمجھتے ہیں، لیکن ہندوستان زیادہ اغلب ــــــ اس لیے کہ مہکدار

پیڑوں کی شاخیں ہندوستان کی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک لاطینی شاعر نے ققنس کا تعلق رومن سلطنت کے ساتھ جوڑا تھا، کچھ پادریوں نے اس کو یسوع کی موت اور پھر زندہ ہونے کی روایت کے ساتھ وابستہ کیا، اور کچھ لوگ اس کو کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے یسوع کی پیدائش کے ساتھ جوڑتے ہیں لیکن میں اس کو ہر سچے ادیب کی ہستی کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہوں ——— چاہے وہ کسی ملک کا ہو، اور چاہے کسی صدی کا!

ایک ڈائری کے اقتباسات

ڈائری لکھنے کی میری عادت نہیں۔ کئی بار کوشش کی، لیکن دو چار دن سے زیادہ مجھ سے اس کی پابندی نہیں ہو سکی۔ شائد اس کا ایک حزیں پس منظر تھا ——— جو شعوری طور پر تو نہیں، لیکن غیر ارادی طور پر ہمیشہ میرے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا...... معلوم نہیں.....

پس منظر یاد ہے ——— اس وقت چھوٹی تھی جب ڈائری لکھا کرتی تھی اور ہمیشہ تالے میں رکھا کرتی تھی۔ لیکن الماری کے اندرونی خانہ کے اس تالی کو شائد یوں ضرورت سے زیادہ احتیاط سے سنبھال سنبھال کے رکھتی تھی کہ اس کی سنبھال کسی کی نظر میں چڑھ گئی۔ (یہ شادی کے بعد کا واقعہ ہے) ایک روز مجھ سے چوری اس الماری کا خانہ کھولا گیا اور ڈائری کو پڑھا گیا۔ اور پھر مجھ سے ڈائری کی کئی سطروں کی تفاصیل طلب کی گئیں۔ اس روز کی سزاوار ہو کر میں نے ڈائری پھاڑ دی تھی اور آئندہ کبھی ڈائری نہ لکھنے کا اپنے سے عہد کیا تھا۔

پھر بڑی ہوئی تو اپنا ہی عہد اپنے آپ کو نادان لگا۔ اس عہد کو توڑ کر پھر ڈائری لکھنے کے لیے ارادہ پختہ کیا۔ کچھ عرصہ لکھتی رہی۔ اور پھر اچانک وہ ڈائری میرے کمرے میں سے چوری ہو گئی۔ یہ ظاہر تھا کہ ایک معمولی چور کی ضرورتوں میں یہ ضرورت نہیں ہو سکتی تھی، یہ کسی خاص کی ہی ضرورت ہو سکتی تھی۔ کئی سال مجھے اس کا غم لگا رہا، آج بھی اس کی کسک سی قائم ہے۔ جس شانتی بی بی پر مجھے اس ڈائری کے سرقہ کا شبہ ہے، اب چاہتے ہوئے بھی اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ وہ حادثات تھے، جن کے باعث، شاید میں پھر کبھی باقاعدہ ڈائری نہیں لکھ سکی۔ ہاں، کبھی کبھی اُبال سا آجاتا تھا، برس، چھ ماہ میں کچھ سطریں لکھ چھوڑتی تھی۔ آج ان منتشر اوراق کو منتشر تاریخوں کے تحت ڈھونڈتے لگی ہوں تو وہ بھی زیادہ نہیں ملے۔ جو کچھ مل سکے ہیں ــــــ وہ یوں ہیں

"تہمت معاصر ہیں، صرف ایک میں، میرا معاصر نہیں" ــــــ یہ نظم کی پہلی سطر تھی، لیکن ابھی آگے کچھ نہیں تھا لکھا، یوں معلوم تھا کہ یہ ساری آزردگی خود سے خود تک کی بات تھی۔ اسی کے ساتھ تعلق رکھنے والی کچھ سطریں تھیں، ابھی کاغذ پر نہیں اتری تھیں، لیکن چھاتی میں متحرک تھیں ــــــ "میں بغیر میرا جنم، ثواب کی تھالی میں جرم کا ایک شگون ہے...." کہ آنکھیں اخبار کے پہلے صفحے پر کانپنے لگیں ــــــ "سوویت رُوس آکو پائی چیکوسلواکیہ..... سرپرائز اِن ومیئن ٹوسٹیشن، ریشین ڈرائیو..... فیٹ آف ڈبچیک اَن سرٹین...." اور ابھی جو خود، صرف اپنا تھا ــــــ معلوم نہیں، کس کس کا خود، بن گیا ہے ــــــ فاشزم کی ہولناکی جھیلی نہیں، صرف سنی ہے، یا اس کے زخم خوردہ ملکوں میں گھومتے ہوئے اس کی کچھ علامات دیکھی ہیں۔ تو بھی اس کا قیاس ہولناک ہے۔ اسی لیے نوشلزم کے ساتھ خواب وابستہ ہوتے ہیں۔ اس نے جن ملکوں میں جو کچھ حاصل کر لیا ہے، اس کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن اس سے آگے جو کچھ حاصل کرنے سے ورے وہ رک گیا ہے، ٹیس صرف اس کی ہے.....

اس کا پگھلا ہوا چہرہ کبھی دفعتاً بڑا حاکمانہ اور شکن آلود نظر آنے لگتا ہے، اور گوشت کے ہونٹوں پر جو لفظ آتے ہیں، وہ خودکشی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لگتا ہے، اگر وہ خودکشی سے بچتے ہیں، کاغذ پر اترتے ہیں، تو قتل ہوتے ہیں۔

نظم میرے گرد چکر کاٹتی، پتہ نہیں، کہاں چلی گئی ہے ــــــ کہاں کی کہاں، کاغذ پر صرف اپنے نقش پا چھوڑ گئی ہے ــــــ

بندوق کی گولی
اگر ایکبار مجھے چھوٹی میں لگتی ہے
تو دوسری بار پراگ میں لگتی
اور ایک دھواں ہوا میں تیرتا ہے

اور میرا اللہ میں انٹھا ہے بچّے کی طرح مرتا ہے۔۔۔۔

۲۲۔ اگست، ۱۹۶۸ء

"Mr. cernik said "Go away and urge the best brains of the country to get out whilst they can..."

یہ خبر آج میرے یوم پیدائش پر دنیا کی طرف سے کس طرح کی سوغات ہے؟
آرتھر کوسلر نے اپنا ہاروسکوپ بنانے کے لیے اپنے پیدائش کے روز شائع ہوئے اخبارات تلاش کئے تھے۔ دیکھا تھا کہ جس روز وہ پیدا ہوا، اس روز دنیا میں کون سے حادثے وقوع پذیر ہوئے تھے ـــــ کون سا جہاز غرق ہوا تھا، کس بنک میں ڈاکہ پڑا تھا ـــ کن ملکوں کے درمیان سمجھوتے طے پائے تھے یا شکست ہوئے تھے۔۔۔ "ہر زائچہ آدم کی پیدائش کی ایک جھوٹی گواہی دیتا ہے۔۔۔۔" کے بعد اگر کوئی ہاروسکوپ سوچا جا سکتا ہے تو آرتھر کوسلر والا، سو میری سالگرہ کے روز یہ خبر کس طرح کی خبر ہے۔ ابھی ایک عجیب ٹیس بھری نظم لکھی ہے ـــ "دیوار پر ٹنگی ایک فیملی فوٹوگراف۔۔۔۔"

۳۱۔ اگست، ۱۹۶۸ء

کافی رات ہو چکی تھی، گلزار کا ٹیلی فون آیا ـــ "اتنی رات گئے فون کرتے ڈر رہا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "بھلے آدمی! ڈرنے کی کونسی بات ہے، میں سٹالنسٹ نہیں!" تب وہ بھی ہنس پڑا۔ کہنے لگا ـــ "اچھا، پھر ایک سٹالنسٹ سے بات کرو، میرے پاس بیٹھا ہے اسی نے فون کروایا ہے"

اور سنت سنگھ سیکھوں کی آواز آئی ـــ "کیا حال ہے، مہاراج؟"

سیکھوں میں ایک جاٹ کی زندہ دلی بھی ہے، اس لیے میں نے ہنس کر کہا ـــ "میرا حال پوچھو گے یا حال بھی ڈکٹیٹ کرو گے، جیسے چیک لوگوں کو دوستی ڈکٹیٹ کروا رہے ہو۔۔۔۔"

سیکھوں ہنسنے لگ پڑا ـــ "اس طرح کے حملوں سے نہیں گھبرایا جاتا ہے گورو ساتھ بدلتا، سکھ صدق نہ ہارے!"

کہا ـــ "دھن سکھی، سیکھوں صاحب! گورو بھی بدل لیا تو بھی صدق نہیں ہارا

لیکن گوروبانی کی آڑ سے باہر آکر بات کرو!"

یہ کل رات کی بات تھی، ۳۱۔ اگست کی رات کی، اور آج ایک ہنگرین ادیب ڈاکٹر انتسٹ وان کے گھر آنے پر جب میں نے کچھ پنجابی ادیبوں کو بھی بلا لیا تو ان میں سیکھوں بھی تھا۔ میٹنگ کے بعد جب سب چلے گئے، سیکھوں نے میرے پاس بیٹھ کر تازہ حادثے پر ایک نظم لکھی —— جس میں سوشلزم ایک کنواری نازنین، عوام، کا ریپ کرتا ہے۔ نازنین کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں، لیکن بعد میں مسکراتی ہے۔

یہ نظم پڑھی تو دل بہت اداس ہوا —— ہمارے مفکر سوشلزم کا کس قسم کا تصور قائم کر رہے ہے —— جو عوام کا دل مسخر کرنے کے بجائے عوام کا ریپ کر کے ہیرو دکھایا جا رہا ہے! یہ سوشلزم عوام کا کس طرح کا محبوب ہے؟ بے چارے عوام۔۔۔

۱۔ستمبر ۱۹۶۸ء

آج چیک لوگوں نے اپنے مکانوں، گلیوں، بازاروں اور سڑکوں کے نمبر مٹا دیے ہیں۔۔۔۔ نظم لکھی ہے۔ میرا پتہ ——

آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹایا ہے
اور گلی کے ماتھے پر لگا گلی کا نام ہٹایا ہے
اور ہر سڑک کی سمت کا نام پونچھ دیا ہے
لیکن اگر آپ نے مجھے ضرور ڈھونڈنا ہے
تو ہر دیس کے، ہر شہر کی، ہر گلی کا در کھٹکھٹاؤ
یہ ایک سراپ ہے، ایک ور ہے
اور جہاں بھی آزاد روح کی جھلک پڑے
—— سمجھنا وہ میرا گھر ہے۔۔۔۔

۶۔ستمبر، ۱۹۶۸ء

پی، سی، جوشی کا آرٹیکل بہت ہی تدبر بھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ پڑھ کر اس کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہا۔ پوچھ گچھ کر کے اس کا ٹیلی فون نمبر معلوم کیا۔ اس کی آواز بھی اس کے مضمون ایسی ہے —— فرینک اور بولڈ۔ اس نے بتایا کہ اس کے دوست اس مضمون کی وجہ سے اس کے ساتھ خفا ہو گئے ہیں، خاص کر ارونا آصف علی۔ اور اس نے کہا —— "یہ تمہارا

میرا المیہ ہے کہ صرف سیاسی لیڈروں نے نہیں، ہمارے ادیبوں نے بھی اپنے ذہن گروی رکھے ہوئے ہیں .....

کل ہی گوربخش سنگھ کا مضمون پڑھا تھا ـــــ معلوم نہیں، ہمارے پنجابی ادیبوں کو کیا ہوگیا ہے ....

معانی کی رنگی ڈھانپنے کو
میں نے ان کی گردن میں لفظوں کی بانہہ ڈلوائی تھی
یہ لفظ شاید کسی دستور پر نہیں رکتے؛
آج وہی لفظ معانی کا ریپ کرکے لوٹتے ہیں
اور شرمسار میرے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتے ....

۷ ستمبر، ۱۹۷۸ء

روز جب دن چڑھتا ہے ـــــ شہر کے سارے محلے ایک دوسرے کو بھونکنے لگتے ہیں ....

ان میں سے کئی پالتو کتوں ایسے ہیں جن کی صابن کے ساتھ دھوئی ہوئی فر روز چمکی ہوتی ہے، اور جن کو دودھ میں بھیگی ہوئی روٹی اور گوشت کے موٹے موٹے ٹکڑے روز کھانے کو ملتے ہیں ـــــ

زیادہ تر گرد اور مٹی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ ہڈی پا لیتے ہیں جس کو سارا دن چچوڑتے رہتے ہیں ....

کئی خارش شدہ کھال والے ہیں جو سارا دن اپنی ایک ٹانگ کے ساتھ اپنے جسم کو کھجاتے رہتے ہیں۔

سارے اونچے اونچے بھونکتے رہتے ہیں۔ صرف جھگیاں اور جھونپڑیاں ننھے ننھے پلّوں کی مانند کاٹنے کو نہیں دوڑتیں، صرف ٹاؤں ٹاؤں کرتی رہتی ہیں ....

اور روز جب شب اترتی ہے ـــــ سارے محلے اپنی اپنی زبان کے ساتھ اپنے اپنے زخموں کو چاٹتے ہیں ....

ہاں سچ، ـــــ یہ سبھی ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتے، کبھی کبھی دشمول کو بھی بلاتے ہیں، خاص کر انتخابات کے دنوں میں، جب ان کے آگے کوئی باسی بچی روٹی پھینکی

کے ٹکڑے پھینک دیتا ہے یا خیالی پلاؤ کے چند لقمے . . . .

پیدا گوجرانوالہ ہوئی تھی، لیکن عمر دو شہروں میں گذری ہے ——— آدھی لاہور میں، آدھی دہلی میں ——— آدھی غلام ہندوستان میں، آدھی آزاد ہندوستان میں ۔ لیکن جس پہلو سے کسی شہر کی پورٹریٹ کا سوال ہوتا ہے، یہ مذکورہ بالا پورٹریٹ جیسی لاہور کی دیکھی تھی، ویسی دہلی کی دیکھی ۔

۲۱ ۔ اگست ۱۹۷۰ء

تلوار کا لمس

بہت سگریٹ پیتی ہوں ۔ اور کبھی کبھی کسی دن مجھے وہسکی بھی اچھی لگتی ہے ۔ اس کو روز عادت کے طور پر نہیں پی سکتی، لیکن کسی دن اچانک اس کی تیکھی طلب ہوتی ہے ۔ جانتی ہوں ——— یہ دونوں چیزیں جب کسی عورت کے ساتھ وابستہ ہو کر ایک ذکر بنتی ہیں ۔ یہ ذکر عورت کی شخصیت کو سنجیدگی لفظ کے ساتھ نہیں جوڑتا ۔ مجھے اس کے لیے ایک عجیب مثال یاد آئی ہے ۔ آخر سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں ۔ مثال کے لیے اسی مذہب کی کسی مخصوص علامت کا سامنے آجانا قدرتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ——— جیسے میٹھا حلوہ بنا کر جب گورو گرنتھ صاحب کے سامنے رکھا جاتا ہے، اور حلوے کی پرات میں تلوار پھیری جاتی ہے تو ——— وہ معمولی حلوے کی جگہ اسی وقت کڑاہ پرشاد بن جاتا ہے ۔ اسی طرح میرے ہاتھ میں پکڑا عام سگریٹ یا وہسکی کا جام جب میری پیشانی کے افکار کو چھو لیتا ہے، ——— وہ کچھ اور ہو جاتا ہے، پاکیزگی ایسا ۔ احساسات کی شدت اور وسعت اس میں سے تلوار کی مانند گذر جاتی ہے، تو وہ معمولی حلوے کے بجائے اسی پل پرشاد بن جاتا ہے ۔

۳۱ ۔ اگست ۱۹۷۲ء

آج کا اخبار کہہ رہا ہے ——— رام دھاری سنگھ دنکر نہیں رہے ۔ گذشتہ ہفتے آج کا دن تھا ۔ آج ۲۵ تاریخ اور اس روز ۱۹ تاریخ تھی ۔ سٹار ٹیکس کے جشن کے موقعہ پر دنکر تھے ۔ میں ہال میں سے باہر آرہی تھی، اور وہ باہر آکر کار میں بیٹھ چکے تھے ۔ دور سے دیکھ کر ہاتھ کے اشارہ سے انہوں نے پاس بلایا، دلیپ بیندر بھی میرے ہمراہ تھا ۔ میں ان کی کار کے شیشے کے قریب پہنچی تو شیشے کو اتار کر، اپنا بازو باہر نکال کے میرا

ہاتھ تھامے [illegible] گے ۔ ۔ ـــ دیکھو، مر نہ جانا۔ تم مر گئیں تو اس ملک کی ہریالی مر جائے گی" معلوم تھا، وہ بیمار رہتے ہیں۔ دل بھر آیا کہا "لیکن آپ زندہ رہیں یہ بات کہنے کے لیے۔ آپ کے بغیر یہ بات اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ۔ ۔"

میرا دل تو جل ہی گیا تھا، پاس کھڑے دیویندر کا دل بھی جل گیا ـــــ کہنے لگا ـــــ "دیدی! ہماری زبان میں اس طرح کے لوگ کیوں نہیں پیدا ہوتے؟"

آج دنکر چلے گئے ہیں ـــــ صرف ہندی زبان سے نہیں، ہندوستان سے چھین لیے گئے ہیں۔ ۔ ۔ آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ ۔ ۔

۲۵- اپریل ۱۹۷۴ء

ایک رات

کئی بیگانی باتیں، معلوم نہیں، کیسے اصلاً اپنی بن جاتی ہیں اور اپنے خون اور گوشت میں بھیگ جاتی ہیں۔ ایک بار رات کو مہابھارت پڑھتے سو گئی ـــــ خواب میں دیکھا، ایک کبوتر اڑتا ہوا آیا اور اس نے میری گود میں پناہ لے لی۔ دیکھا ـــــ اس کے تعاقب میں باز چلا آتا ہے۔ اس نے مجھ سے کبوتر کی مانگ کی۔ کبوتر اپنی زندگی کی حفاظت مانگتا میرے ساتھ بھینچ کے لگا تھا۔ باز نے مطالبہ کیا کہ اگر کبوتر نہیں دینا چاہتی تو اس کی جگہ اپنے بدن کا گوشت تول کر دے دو۔ میں نے بدن سے گوشت کاٹ کر اس کے ہم وزن تولنا چاہا، لیکن کبوتر اور بھاری ہوتا گیا۔ اور بھاری، اتنا کہ میں پوری کی پوری اس کی جگہ مرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ ۔ ۔ ایک قہقہہ کانوں میں گونجا اور ساتھ ہی سارے بدن میں ایسا احساس ہوا کہ یہ کبوتر میری قلم کا روپ ہے ـــــ اور ایک مخالفت اس کو جان سے مار ڈالنے کے لیے اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

میں کبوتر کو اور بھی بھینچ کر اپنے جسم کے ساتھ لگا رہی تھی ـــــ کہ میری نیند کھل گئی۔ ۔ ۔ سامنے مہابھارت کا وہ صفحہ کھلا پڑا تھا ـــــ جس میں، بارہویں باب میں، اگنی دیوتا کبوتر کی صورت اختیار کر کے راجہ اشینر سے پناہ مانگنے آتا ہے اور راجہ اشینر اس کے بجائے اپنے جسم کا گوشت دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن کبوتر کو پیچھے پڑے ہوئے باز کے حوالے نہیں کرتا۔ ۔ ۔

اس واقعہ سے میں نے اپنے جذبات کی شدت کو محض پہچانا نہیں، ایک رات گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ایک دن

وہ بھی ایک دن تھا ——— جب میں نے اپنے بارہ میں اس قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بجائے سوچا تھا ——— کبھی جب میں اپنی سوانح حیات لکھوں گی، صرف دس سطریں لکھوں گی، اور وہ سطریں میں نے کاغذ پر لکھ کر رکھ لی تھیں۔ وہ سطریں آج بھی میرے سامنے ہیں۔ اور آج بھی وہ اتنی ہی سچی ہیں، جتنی اس روز لکھتے وقت تھیں۔

میری تحریر، کیا نظم اور کیا نثر، میں جانتی ہوں کہ غیر قانونی بچے کی طرح ہے۔

میری دنیا کی حقیقت نے میرے دل کے خواب سے عشق کیا، اور ان کے وصلِ ممنوع سے یہ تحریر پیدا ہوئی۔

جانتی ہوں ——— ایک غیر قانونی بچے کی قسمت اس کی قسمت ہے اور اس کو ساری عمر اپنے ادبی سماج کی پیشانی کے بل سہنے ہیں

دل کا خواب کیا تھا، کون تھا، اس کی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کمبخت بہت حسین ہوگا، ذاتی زندگی سے لے کر کل کائنات کی بہتری تک کی باتیں کرتا ہوگا تب ہی حقیقت اپنی اوقات کو بھول کر اس سے عشق کر بیٹھی۔ اور تحریر جو پیدا ہوئی ——— ہمیشہ کچھ کاغذوں میں لاوارث بھٹکتی رہی . . . . .

اور آج بھی میرا یقین ہے ——— یہ دس سطریں میری پوری اور طویل سوانح حیات ہے . . .

ایک نظم

"جیک نمبر ۳۶" ناول میں نے ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا، ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تو افواہ پھیل گئی کہ پنجاب سرکار اس کو بین کر رہی ہے۔ لیکن ہوا کچھ نہیں ——— یہ ۱۹۶۵ء میں ہندی میں بھی شائع ہوا اور ۱۹۶۷ء میں اردو میں بھی۔

اس ناول کو فلم کے لیے ڈھالنے کی بات سوچی تو زیوتی سرن شرما نے کہا ——— "نہیں، یہ ناول وقت سے ایک صدی قبل لکھا گیا ہے، ہندوستان ابھی اس کو سمجھ نہیں سکتا۔" اور باسو بھٹا چاریہ کے الفاظ تھے ——— "اس ناول پر جب فلم بنے گی، وہ فلم ہندوستان کی پہلی

ناٹیڈلٹ . فلم ہو گی ـــــ" اور اس ناول کا جب میری دوست کرشنا نے ۱۹۷۴ میں انگریزی میں ترجمہ کیا، تو اس کی ریڈنگ کے لیے میں نے جب اس کو دوبارہ پڑھا، تو اس کی کردار الکا میرے اوپر اس طرح چھا گئی جس طرح شاید ناول لکھتے وقت بھی نہیں چھائی تھی . . . .

اس کا کردار کمار جب الکا کو بتاتا ہے کہ جسم کی بھوک مٹانے کے لیے وہ کچھ روز ایک ایسی عورت کے پاس جاتا رہا . جو روز کے بیس روپے لیتی تھی - اور جب الکا کہتی ہے ـــــ " سوچ رہی ہوں کہ وہ عورت میں ہی ہوتی ، جس کے پاس آپ روز بیس روپے دے کر جایا کرتے تھے . . . . . "

تو بہت پرانا اس ناول کا سرچشمہ یاد آیا ـــــ ایک بار امروز نے کہا تھا کہ جسم کی بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر میں نے ایک بار بازار کی کسی عورت کے پاس جانا چاہا تھا ، تو دفعتاً میرے مونہہ سے نکل گیا ـــــ اگر تم ایسی عورت کے پاس جاتے ، تو میرا دل کرتا ہے ـــــ وہ عورت بھی میں ہوتی . . . "

پہچان آئی ـــــ یہ لفظ جو الکا نے کہے ، یہ صرف امرتا ہی کہہ سکتی تھی ، دوسری کوئی عورت نہیں . . . غیر فطری حالت کا فطری پن شاید اور کسی عورت کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا ، الکا عرف امرتا . . . .

گو ہر کہانی کے کردار کے ساتھ ادیب کا گہرا رشتہ ہوتا ہے ، لیکن ایک فاصلہ ہر رشتے کا حصہ ہوتا ہے . الکا کا مطالعہ کرتے محسوس ہوا ـــــ وہ فاصلہ کہیں نہیں . . . . اس رات (سات ستمبر ۱۹۷۴ کی رات ، میں نے الکا کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی ـــــ پہچان !

کئی ہزار چابیاں میرے پاس تھیں
اور ایک ایک چابی ، ایک ایک دروازے کو کھول دیتی تھی -
دروازے کے اندر ـــــ کسی کی بیٹھک بھی ہوتی تھی -
اور دبیز پردوں میں لپٹی کسی کی خواب گاہ بھی -
اور گھر والوں کے غم ـــــ
جو ان کے ہی ہوتے تھے ، لیکن کسی کسی وقت میرے بھی ہوتے تھے
میرے سینے کی ٹیس ایسے ـــــ
ٹیس ، جو دن کے وقت جاگوں ، تو جاگ پڑتی تھی -
اور رات کے وقت خوابوں میں اتر جاتی تھی -

لیکن پھر بھی
پاؤں کے آگے، حفاظت کی لکیر ایسی، ایک رام لکیر ہوتی تھی
اور جس کی بدولت میں جب چاہتی تھی
گھروں کے مکینوں کے غم ان کو لوٹا کر
اس لکیر کے پاس سے لوٹ جاتی تھی
اور لوٹتے وقت لوگوں کے آنسو لوگوں کو سونپ آتی تھی۔ ۔ ۔
دیکھ! جتنی کہانیاں اور ان کے کردار ہیں
اتنی ہی چابیاں میرے پاس تھیں۔
اور جن کی وجہ سے ———
ہزاروں ہی گھر، جو میرے نہیں۔ تاہم میرے بھی تھے۔ ۔ ۔
شائد وہ کہیں اب بھی ہیں
لیکن آج ایک چابی کی کرامت
میں نے تمہارے گھر کو کھولا تو دیکھا ———
وہ رام لکیر میرے پاؤں کے آگے نہیں۔ پیچھے ہے
اور سامنے ——— تیری خوابگاہ کے اندر ——— تو نہیں، میں ہوں۔ ۔ ۔
یہ میری واحد ایسی نظم ہے ——— جو اپنے ہی تخلیق کردہ کردار کو مخاطب ہو کر میں نے لکھی ہے۔

ایک تیوری

آج بھی سامنے دیکھ سکتی ہوں ——— ایک تیوری سے، میرے والد کی پیشانی پر پڑی ہوئی۔ نہیں، پیشانی پر کھڑی ہو کر چالیس برس سے میری طرف دیکھ رہی، میری نگہبان بن کر۔ ۔ ۔
۱۹۳۶ء کے آغاز کی بات ——— جب میری پہلی کتاب شائع ہوئی تھی، مہاراجہ کپورتھلہ نے میری کتاب کو ایک بزرگانہ تھپکی دیتے ہوئے دو سو روپے میرے نام بھیجے تھے۔ اور ہیم چندر رہ راجہ مہارانی ناجہ نے (وہ بھی میرے والد کی شاگرد رہ چکی تھی) مجھے ایک ساڑھی کا پارسل اس کتاب کی تعریف و ستائش کے طور پر بھیجا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ڈاک

کے ذریعے موصول ہوئی تھیں اور پھر ایک اور دن جب ڈاکئے نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا' میرے' بچے کے دل نے، اسی طرح کے ایک اور منی آرڈر یا پارسل کی تمنا کرلی۔ مونہہ سے نکلا۔ "آج پھر کوئی انعام آیا ہے!" ——— اور مجھے آج تک بمعہ اپنے بدن کے لرزہ کے' اسی طرح وہ تیوری یاد ہے جو میری جانب دیکھ کر والد کی پیشانی پر پڑ گئی تھی۔

اس روز اتنا نہیں سمجھ پائی کہ والد میرے اندر جس قسم کی پُر عظمت شخصیت دیکھنا چاہتے تھے، میں اس ایک جملے کے ساتھ اس سے بہت پستہ قد بن گئی تھی' صرف اسی قدر سمجھا کہ اس قسم کی امید یا اس طرح کی آرزو غلط بات ہے۔ یہ کیوں غلط ہے' اور یہ کس پہلو سے ایک ادیب کو پستہ قامت بنا دیتی ہے' یہ بہت عرصہ بعد معلوم ہُوا۔

اور جب معلوم ہُوا ——— میرے والد کی پیشانی کی جگہ میری اپنی پیشانی میری نگہبان بن گئی۔ اس نے میرے خیالات کی اس طرح پاسبانی کی کہ پھر کبھی لاشعوری طور پر بھی اس قسم کا خیال نہیں آیا۔

آج سوچتی ہوں ——— دنیا سے کچھ بھی لینے کے خیال سے' وہ ایک تیوری مجھے کیسے ہمیشہ کے لئے سُرخرو کر گئی۔ آزاد کر گئی' تو اس تیوری کے ماتھے پیار آجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے ——— اس روز وہ والد کے ماتھے پر نمودار نہ ہوتی تو میں کبھی اس قسم کے رُجحان سے زندگی میں اپنی توہین کرلیتی۔ لیکن خوش ہوں' مجھے اس والد کی پیشانی نصیب ہوئی تھی جس کے اوپر وہ تیوری پڑ سکتی تھی۔

یہ بھی ایک رات کی بات ہے' آج سے قریب چالیس سال پہلے کی ایک رات۔ میری شادی کی' جس رات میں مکان کی چھت پر جاکر اندھیرے میں بہت روئی تھی۔ دل میں صرف ایک بات آتی تھی ——— اگر کسی طور مر سکوں! والد کو میرے دل کی حالت معلوم تھی۔ اسلئے ڈھونڈتے ہوئے چھت پر آئے' تو میں نے ایک ہی منت کی ——— میں نے بیاہ نہیں کروانا!

بارات آچکی تھی' رات کا کھانا ہوچکا تھا کہ والد کو ایک پیغام ملا تھا کہ اگر کوئی رشتہ دار دریافت کرے تو کہہ دیجئے گا کہ آپ نے اتنے ہزار روپیہ نقد بھی جہیز میں دیا ہے۔

یہ شادی والد کی گہری تسلی تھی، میری بھی؟ لیکن اس پیغام کو والد نے ایک اشارہ خیال کیا۔ ان کے پاس اس قدر رقم نقد موجود نہ تھی، اس لئے گھبرا گئے۔ مجھے بتایا ـــ تو میری واحد آرزو تھی، ـــ اگر میں مر سکوں۔۔۔۔!

کئی گھنٹوں کی اس گھبراہٹ کو، اس رات مہمان آئی میری مرحوم ماں کی ایک سہیلی، پریتم کور نے کچھ سمجھ لیا اور تنہائی میں لیجا کر اپنے ہاتھوں کی ساری سونے کی چوڑیاں اتار کر والد کے آگے رکھ دیں۔ والد کی آنکھیں بھی آنسوؤں ہو گئیں، لیکن مجھے یہ سب دیکھنا موت سے بھی بدتر معلوم ہوا۔۔۔۔

پھر پتہ لگا ـــ یہ پیغام کسی طرح کا اشارہ نہ تھا، انہوں نے کسی نقد رقم کا مطالبہ نہیں کیا تھا، صرف کچھ رشتہ داروں کی تسلی کی خاطر یہ بات پھیلائی تھی۔ ماں کی سہیلی نے وہ چوڑیاں پھر ہاتھوں میں پہن لیں تھیں۔ لیکن محسوس ہوتا ہے ـــ وہ اتارنے کا لمحہ دنیا کی نیکی کی علامت بن کر ہمیشہ کے لئے کہیں کھڑا ہو گیا ہے۔۔۔۔ یقین ٹوٹتے دیکھتی ہوں، لیکن یاس دل کی آخری گہرائی تک نہیں پہنچتی، ورے راستہ میں کہیں کھڑی ہو جاتی ہے، اور پرے، دل کے آخری سرے کے پاس، دنیا کی نیکی پر یقین بچا رہ جاتا ہے۔۔۔۔

آخری سطریں

بہت عرصہ ہوا "گریک پیشن" میں ایک چرواہے لڑکے کی داستان پڑھی تھی جو کرائسٹ کا ڈرامہ کھیلنے کے لئے کرائسٹ منتخب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کردار کا رول ادا کرنے کے لئے ریہرسل کرتا کرتا وہ کردار کی ہستی میں کھو جاتا ہے۔ اس قدر کہ تمام گاؤں کی مخالفت سہہ کر، اس کی نظروں میں جو انصاف ہے، اس کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ تب گاؤں والے اس کو سچ مچ پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ کوئی وہ جس نے اس کا ظاہر و باطن پہچان لیا تھا، اس کو ایک پہاڑی پر دفنانے وقت کہتا ہے ـــ آج وہ نام برف پر ثبت ہو گیا ہے۔ برف پگھلے گی، تو اس کا نام دریاؤں اور نالوں کے پانیوں کے اوپر ثبت ہو گا۔۔۔۔؟

اسی تمثیل کو اپنے لئے بیان کروں تو کہنا چاہونگی۔ میرے پاس جو کچھ تھا،

اگر آج برف میں دفن ہو گیا ہے، تو یہ برفیں جب پگھلیں گی، اس کے دریا و نالے وہ ہوں گے جو ایمان کے ساتھ ہاتھوں میں نئی قلمیں پکڑیں گے، اور ان قلموں کی شدت میں میرا وہ کچھ بھی ملا ہوگا جو آج خاموشی کی برف میں دب گیا ہے۔

حقیقت سے حقیقت تک

خود نوشت سوانح حیات کو اکثر خیلک و مک جیری یک طرفہ سچائی خیال کیا جاتا ہے ——— خود ستائش کا فن کارانہ وسیلہ۔ لیکن بنیادی سچائی کو ادیب کی اپنی ضرورت مان کر میں کہنا چاہوں گی ——— یہ حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل ہے۔

ایک کچھ وہ ہوتی ہے ——— جو سامنے، بغیر کسی تردد کے نظر آجاتی ہے، اور ایک صرف نظر جا کر دکھائی دیتی ہے، اور ایک خیالات کی شئے کو چھان چھان کر ڈھونڈی جاتی ہے ——— حقیقت وہ بھی ہوتی ہے، وہ بھی، اور وہ بھی!

ہر ایک فن، تعمیر میں سے نئی تعمیر کا نام ہے۔ یہ حقیقت کی دوبارہ تعمیر بھی حقیقت سے سچائی کی کوکھ میں پڑ کر پھر اس کوکھ سے نکلی ہوئی سچائی۔ حقیقت کی تعمیر ثانی، حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل ہے۔

ناول یا کہانی کا ناظر کرداروں میں سے ان کے چہروں کا قیاس لگاتا ہے، ان کی باطنی ہلچل سے ان کے خد و خال کا تصور کرتا ہے، لیکن کسی کی آپ بیتی کو پڑھنے والا اپنی تمام تر توجہ ایک ہی جانے پہچانے چہرے پر مرکوز کرتا ہے۔ اس میں مصنف اور ناظر رو در رو ہوتے ہیں۔ یہ مصنف کا اپنے گھر میں پڑھنے والے کو نجی بلاوا ہوتا ہے، شرم اور جھجک کی دہلیز کے اندر اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے ——— جب مصنف کا حوصلہ اس کے کسی سچ سے کم تر نہ ہو۔ اس میں کوئی دروغ بیانی مہمان کی نہیں، میزبان کی اپنی ہتک ہوتی ہے۔

ادیب دو طرح کے ہوتے ہیں ——— ایک جو ادیب ہوتے ہیں، اور دوسرے جو ادیب دکھائی دینا چاہتے ہیں۔ جو ہیں دکھائی دینے کی سعی ان کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ ہیں! اور ان کی اپنی ہستی کی سچائی، سچائی سے کم کچھ بھی منظور نہیں کر سکتی۔

صرف اس پار کی حقیقت جیسے فن کا دریا عبور کر کے اُس پار کی حقیقت بنتی ہے، وہ عمل اس آپ بیتی میں بھی ہے۔ یہ تخلیق کا اپنا عمل ہے۔ میں اس کو حقیقت سے حقیقت تک کہنا چاہوں گی۔

جنگ جاری ہے

یوں تو یہ عنوان میں نے اپنی اس تحریر کا قائم کیا تھا، جو اندرا گاندھی پر بن رہی فلم کے متعلق لکھنی تھی۔ ان کے ساتھ ملک کی حالت کے بارہ میں جو بات چیت ہوا کرتی تھی، وہ تو قلم بند کرنا ہی ہوتی تھی، لیکن شاٹ کیسے اور کیا سوچ کر لیے جاتے ہیں، اندرا جی کی شخصیت کے سنجیدہ پہلو عام معمولی سی باتوں میں سے بھی کیسے ابھرتے ہیں، یا کچھ وہ باتیں، جو فلم کا حصہ نہیں بنتیں لیکن یوں بڑی اہم ہوتی ہیں، ان کو بھی جتنا کچھ پکڑ میں آ سکتیں، لکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ مثلاً —— دیوار پہ کے اوپر نہرو جی کی اور موتی لال جی کی کچھ تصویریں تھیں۔ باسودا نے ان کے شاٹ لیتے وقت اندرا جی سے کہا —— "ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے، جیسے اچانک ان پر کچھ دھول پڑی ہوئی نظر آئے، اور آپ اپنی ساڑھی کے پلو سے اس کو پونچھ رہی ہوں ....." ظاہر ہے کہ باسودا اس شاٹ میں اندرا جی کو وقت کی دھول پونچھتے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن اندرا جی نے مستحکم لہجہ میں انکار کر دیا۔ کہنے لگیں —— "جھاڑن لے کر پونچھ سکتی ہوں، اپنی دھوتی کے دامن سے نہیں .... تصویر چاہے کسی خاص ہستی کی ہو، یہ سوال نہیں۔ جو اچھے لگتے ہیں، وہ ہر وقت خیالوں میں رہتے ہیں، تصویروں میں نہیں۔ ساڑھی کے پلو سے پونچھوں تو پھر مجھے ساڑھی تبدیل کرنا پڑے گی .... مجھے دھول کے ساتھ کوئی انس یا عقیدت نہیں ....."

صحیح ہے، جو ان کے خیالوں میں ہیں، وہ کسی شاٹ میں نہیں آنا چاہیے۔ انہوں نے جھاڑن کے ساتھ تصویریں صاف کیں، اور باسودا نے شاٹ لے لیا۔ لیکن یہ ان کا طرزِ فکر فلم میں نہیں آئے گا۔ اور کئی کچھ جو فلم میں نہیں آ سکتا، اس کو سمجھنے کی کوشش میں میں اس فلم کا ماحول اور اس کی تیاری کا وقت تحریر کرتی رہی۔

اسی لیے ایک شوٹنگ کے وقت میں نے ان سے پوچھا تھا "اندرا جی! آپ کا عورت ہونا کبھی آپ کے کاموں میں حارج ہوا ہے؟" تو ان کا جواب تھا —— "اس کے کچھ ایڈوانٹیجز

امتیا اور اس کا نواسہ کارتک — ۱۹۷۲ء

امرتا ایک سال کی عمر میں

امرتا کے والد سردار کرتار سنگھ

امرتا آل انڈیا ریڈیو دلی — ۱۹۴۸ء

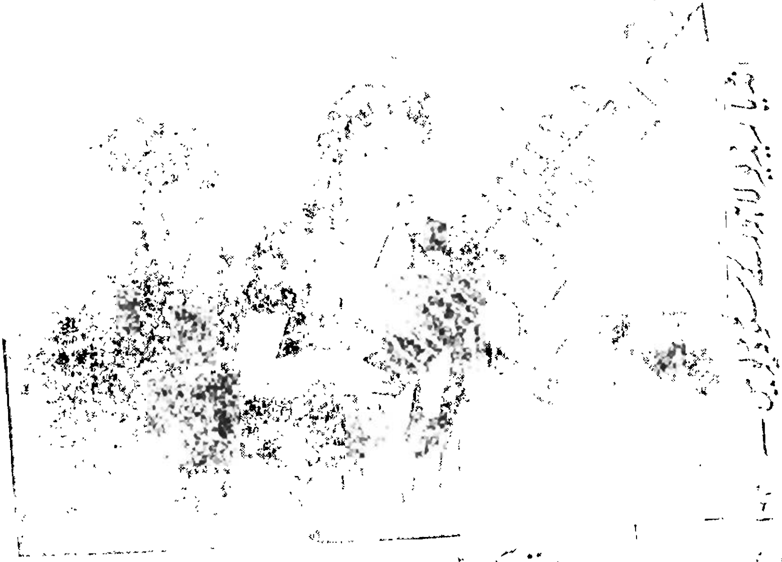

انڈیا ریڈیو لاہور کے سٹوڈیو میں —

امرتا آل انڈیا ریڈیو لاہور — ۱۹۳۸ء

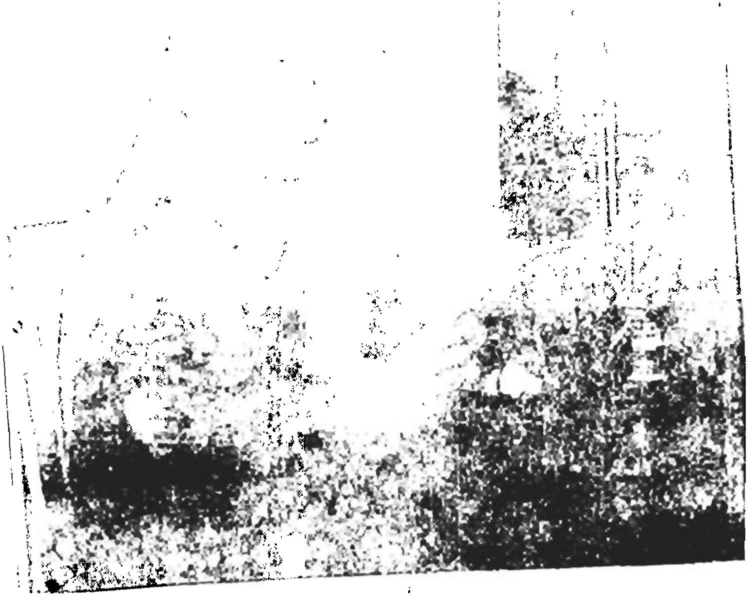

امرتا اور امروز

امرتا اور ساحر

بھی چھپتے ہیں، کچھ ڈرس ایڈوانٹیج بھی، لیکن میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ عورت مرد کی رعائت کے بغیر، میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ انسان خیال کیا ہے۔ ابتدا سے جانتی تھی کہ میں کام کے اہل ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو، مردوں سے زیادہ بہتر طور پر سلجھا سکتی ہوں، سوائے اس کے کہ جسمانی طور سے زیادہ وزن نہیں اٹھا سکتی، اور ہر بات میں ہر طرح قابل ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے عورت ہونے کو کبھی کسی کمی کے پہلو سے نہیں سوچا.... جنہوں نے آغاز میں مجھے صرف عورت خیال کیا تھا، میری طاقت و اہلیت کو نہیں پہچانا تھا، یہ ان کا انداز فکر تھا، میرا نہیں.... لوگ کچھ باتیں بناتے ہوں گے۔ زیادہ تر تو مجھ تک پہنچتی ہی نہیں، جو پہنچتی ہیں، ان کی میں کوئی وقعت نہیں سمجھتی!"

نظریہ میرا بھی یہی تھا، لیکن اندرا جی کے لیے جو دل کی طبعی اور معمولی حالت ہے، میرے جیسے معمولی انسان کے لیے ایک ایسی منزل کی طرح تھی، جس کا راستہ بڑا دشوار گذار تھا۔ یہ صحیح ہے، اب اتنا دشوار نہیں رہا، لیکن میری یہ جنگ ابھی بھی جاری ہے.... اس عنوان کو میں نے اندرا جی کی سیاسی جدوجہد کے لیے استعمال کیا تھا۔ لیکن یہاں اپنی نجی زندگی کے متعلق استعمال کر رہی ہوں، اگر اس کے مقابلے میں اس کی اہمیت بہت چھوٹی ہے....

عرصہ پہلے کی بات ہے کہ جب پٹیل نگر کے مکان میں ابھی بجلی نہیں تھی، اور میں دہلی ریڈیو میں ملازمت کرتی تھی، پڑوسیوں کے گھر میں ایک ریڈیو تھا جو بیٹری سے کام کرتا تھا اور میرے دونوں چھوٹے بچے وہاں چلے جایا کرتے تھے، شام کو میری آواز سننے کے لیے۔ لیکن ایک روز میں رات کو جب گھر لوٹی تو میرا بیٹا مجھ سے کہنے لگا

"ماما! ایک بات مانیں گی؟ آپ بھولو کے ریڈیو پر نہ بولا کریں۔"

معلوم ہوا کہ میرے لڑکے کے ساتھ بھولو کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور جس کے گھر وہ نہیں جا سکتا تھا، وہاں میری آواز بھی نہیں جانا چاہیے تھی۔

اس وقت اپنے چار سالہ لڑکے کی اس بات پر ہنسی آئی تھی، لیکن آج یہ یاد آئی ہے تو ہنس نہیں سکتی۔ سوچتی ہوں ـــــ کاش! میری یہ کتاب بھی ان ہاتھوں میں نہ جائے، جنہوں نے اس کے ایک ایک حرف کو مٹی میں خوار کرنا ہے....

"رسیدی ٹکٹ" کے پہلے ایڈیشن کے وقت میں نے آخری سطریں لکھی تھیں ـــــ "کچھ دوستوں کی صلاح ہے کہ میں اس کتاب کو دوسری زبانوں میں چھپوا لوں، لیکن پنجابی میں نہیں۔"

لیکن جانتی ہوں ——— میری زبان کے سنجیدہ ناظرین یہ نہیں چاہیں گے۔ اور میں کسی قیمت پر بھی، اپنی زبان اور اس کے ناظرین کا درجہ کم نہیں کرنا چاہوں گی۔ جو قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں!" ——— البتہ آج اس کے ساتھ کچھ اور سطریں جوڑنا ضروری ہیں

جہاں تک پنجابی پریس کا سوال ہے ——— مذکورہ بالا سطریں آج بھی اتنی ہی سچ ہیں، جتنی اوّل بار اس کتاب کے شائع کرنے کے وقت تھیں۔ پنجابی پریس کی ذمہ داری، ہمیشہ کی طرح، یا مخالفت کے ساتھ رہی یا خاموشی کے ساتھ۔ لیکن اس کتاب کے پہلے ایڈیشن نے مجھے بہت پیارے ناظرین دیے ہیں، اتنے کہ ان کے خط پڑھ پڑھ کر میری آنکھوں میں پانی آجاتا رہا۔ کسی نے اس کتاب کو آگ کی سیاہی سے لکھا کہا، کسی نے وہ لمحہ، قفنس دھکدار شاخوں کے گھونسلے میں بیٹھ کر دل کی آگ کی حدت سے گاتا ہے۔ اور کئی ایک نے میرے اس جہاد میں فتح کی دعا کی۔ کچھ خطوں کے ذریعے میں نے اپنے پڑھنے والوں کو شکرانہ بھیجا تھا، لیکن اس جگہ اپنے سبھی ناظرین کے لیے کہتی ہوں ——— "رسیدی ٹکٹ نے مجھے آپ جیسے پیارے دل والے ناظرین سے واقف کرایا ہے۔ بیتے سال اور بیتی تلخیاں، آج کے پھولوں کی کھاد مان لوں گی!" میرے ناظرین کے پاس پریس نہیں، تاہم دل ہیں، اور ان کے دلوں پر جو حروف کندہ ہو گئے ہیں، میرے لیے وہ بہت بہت قیمتی ہیں!

——— امرتا پریتم

12½ بجے رات 27-12-1992 [illegible]